ماہنامہ
نومبر 2022ء

طلوعِ اسلام

لاہور
اشاعت کا اناسی واں سال

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

لَا نَبِیَّ بَعۡدِیۡ (الحدیث)

حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد
چشمِ خود بربست و چشمِ ما کشاد

ترجمہ: اکثر شاعر اپنے مرنے کے بعد پیدا ہوتے ہیں، انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ہماری آنکھیں کھول دیں۔

(تمہیدِ اسرارِ خودی اقبال)

طلوعِ اسلام کا مقصد

جو احباب طلوعِ اسلام سے تعارف نہیں رکھتے ان کی آگاہی کے لئے ہم طلوعِ اسلام کے مقصد کو وقتاً فوقتاً سامنے لاتے رہتے ہیں:

1- تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کر سکتی۔ اسے اپنی راہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔

2- خدا کی طرف سے عطا شدہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے ابد تک ضابطہ ہدایت ہے۔ لہٰذا اب نہ خدا کی طرف سے کسی کو وحی مل سکتی ہے نہ کوئی نبی یا رسول آ سکتا ہے۔ قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور حضور رسالتمآب ﷺ خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

3- قرآن کریم کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس حد تک انسانی علم ترقی کر چکا ہے وہ انسان کے سامنے ہو اور چونکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

4- نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مقدسہ، شرف و عظمت انسانیت کی معراجِ کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضور ﷺ کی سیرت طیبہ کا جو حصہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضور ﷺ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضور ﷺ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہئے۔ یہی اصول صحابہ کبارؓ کی سیرت مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جانا چاہئے۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے، ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

5- دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر ان سے خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظامِ مملکت کی رو سے ہو سکتی ہے اس کے بغیر دین (جو نظامِ زندگی کا نام ہے) متمکن نہیں ہو سکتا۔

6- رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآن کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں' ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے امورِ مملکت امت کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔

7- رسول اللہ ﷺ کے بعد دین کا وہی نظام حضور ﷺ کے خلفائے راشدینؓ نے جاری رکھا۔ اس میں امورِ مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

نومبر 2022ء

جلد 75 شمارہ نمبر 11

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول
اقبال ادریس ایڈووکیٹ

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِ تعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 600 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: اقبالؒ کا کلام پھیکا پڑ جائے گا	محمد سلیم اختر	4
غلام احمد پرویزؒ سے علامہ اقبالؒ کے متعلق خصوصی انٹرویو	ایم ایس ناز	6
حرفِ دلنواز	غلام احمد پرویزؒ	13
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا	خالد بشیر فاروقی، لاہور	31
عورتوں پر تشدد قرآنِ کریم کی مذہبی و دینی تفسیر	خواجہ ازہر عباس، کراچی	35
متحرک نفسیات (Dynamic Psychology)	راجہ عبدالعزیز، آزاد کشمیر	40
باب المراسلات	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	53

ENGLISH SECTION

The Human Self and Allah By G. A. Parwez (Translated by: Dr. Ejaz Rasool) Episode No. 12	60

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
چہ باید مرد را طبع بلندے، مشرب نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

محمد سلیم اختر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

اقبالؒ کا کلام پھیکا پڑ جائے گا

1921ء میں غلام احمد پرویز بسلسلہ تعلیم لاہور آئے تو ان کے دادا جان نے انہیں لاہور میں دو بزرگوں سے مِلنے کی تاکید کی۔ ایک امام الدین نجاّر جو نواں کوٹ کے علاقہ میں رہتے تھے اور جن کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ لاہور کے قطب ہیں اور دوسرے علامہ اقبال۔ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ وہ اوّل الذکر بزرگوار سے تو ایک آدھ مرتبہ ہی ملے لیکن حضرت علامہ اقبال کے ہاں جو ایک دفعہ گئے تو ان کے تبحرِ علمی سے فیض یاب ہونے کے لیے بار بار ان کی محفل میں گئے۔ بقول پرویز یہ اقبال ہی کا فیضان تھا کہ ان کی سمجھ میں یہ نکتہ بھی آیا کہ قرآنِ کریم کو عربی زبان اور تصریف آیات کی رُو سے سمجھنا چاہئے اور کسی خارجی عنصر کو اس پر اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔ (بحوالہ ''تصوف کی حقیقت'' باب ''رسم و راہِ منزلہا'' و دیباچہ لغات القرآن صفحہ:19 ایڈیشن 1984ء)

پرویز صاحب کی تصنیف ''مجلس اقبال'' کے ''آغازِ سخن'' میں محمد عمر دراز مرحوم نے لکھا ہے کہ پرویز صاحب نے ایک نجی نشست میں بتایا کہ ان ملاقاتوں کے ابتدائی دور میں ایک دن، حضرت علاّمہ نے اُن سے استفسار کیا کہ پرویز تم ہمارے شعروں پر ہی سر دھنتے ہو یا تمہیں خود بھی کچھ ذوقِ سخن ہے۔ انہوں نے جواباً عرض کیا کہ ہاں میں بھی شعر کہتا رہا ہوں۔ اس پر علاّمہ صاحب نے اُن سے اپنے کچھ اشعار سنانے کی فرمائش کی۔ پرویز صاحب نے کہا کہ جب سے آپ کا کلام سامنے آیا ہے، میرے اپنے شعر پھیکے پڑ گئے تھے، اس لیے میں نے بیاض پھاڑ کر پھینک دی ہے۔ اس پر علاّمہ اقبالؒ نے فرمایا کہ اگر یہ بات ہے تو پھر تمہاری زندگی میں ایک دن ایسا بھی آئے گا جب تمہارے نزدیک اقبال کے شعر بھی پھیکے پڑ جائیں گے۔ پرویز صاحب کہتے ہیں ''اس کے بعد کچھ اور ملاقاتی آ گئے اور ہمارا یہ سلسلۂ کلام جاری نہ رہ سکا۔ لیکن حضرت علاّمہ کی اس بات نے مجھے خاصا پریشان کر دیا۔ یہ بات میرے امکانِ تخیل سے باہر تھی کہ کبھی اقبالؒ کے اشعار بھی بے رنگ ہو سکتے ہیں۔'' اتفاقاً چندروز تک پرویز صاحب مجلسِ اقبال میں حاضر نہ ہو سکے اور ان کا یہ اضطراب اور پریشانی بڑھتی رہی۔ چنانچہ ایک شام وہ خاص اہتمام کر کے، محفل جمنے کے عمومی وقت سے ذرا پہلے حاضرِ خدمت ہوئے اور علاّمہ صاحب کو یہ بات یاد دلا کر پوچھا کہ کیا ایسا ممکن ہے کہ کبھی اقبالؒ کے شعر بھی پھیکے پڑ جائیں۔ اور اگر یہ ہو سکتا ہے تو ایسا کب ہوگا۔ حضرت علاّمہ نے جواب دیا کہ ہاں ایسا ہو سکتا ہے اور یہ اُس وقت ہوگا جب ''قرآن تمہاری سمجھ میں آنا شروع ہو جائے گا۔''

اسد ملتانی علیہ الرحمۃ حضرت علامہ اقبال کے معروف شاگرد ہیں۔ انہوں نے ایک نظم بعنوان ''مقصودِ اقبال''، مجلسِ مرکزیہ یومِ اقبال، لاہور کے منعقد کردہ ''یوم اقبال'' منعقدہ 10 اپریل 1939ء کے لیے لکھی۔ اس نظم کے آغاز میں ایک نوٹ دیا

گیا تھا کہ ''یہ اشعار محض تخیل پر مبنی نہیں ہیں بلکہ ان میں ایک سچے واقعہ کو شاعرانہ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔'' اگر آپ اوپر کی سطور میں بیان کردہ واقعہ کو سامنے رکھ کر اسد ملتانیؒ کی یہ نظم پڑھیں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ یہ نظم بھی اسی واقعہ کو بیان کر رہی ہے جو کہ پرویز صاحب نے ایک محفل میں بیان کیا تھا۔ اسد ملتانی اور پرویز صاحب کی وجہ دوستی بھی اقبال علیہ الرحمۃ ہی تھے۔ اب آپ مذکورہ نظم ملاحظہ فرمائیے:

مقصودِ اقبالؒ

کہا اقبالؔ سے اک ہمنشیں نے — سخن تیرا شراب آتشیں ہے
کچھ اس انداز سے گرما دیے دل — کہ اب تسکین ممکن ہی نہیں ہے
حرارت ہے ترے سوزِ نوا کی — کہ بجلی سی دلوں میں جاگزیں ہے
کلامِ شاعراں پروردۂ عصر — مگر تیرا سخن عصر آفریں ہے
اثر میں ہے یہ صُورِ محشر انگیز — کشش میں نغمۂ خُلد بریں ہے
بدل ڈالا مذاق اس نے ہمارا — دل اب طرزِ کہن پر نکتہ چیں ہے

ترے اشعار پڑھ کر اب نظر میں
کسی کی شاعری جچتی نہیں ہے

یہ سُن کر حضرتِ اقبالؔ بولے — فقط لطفِ سخن کافی نہیں ہے
زمینِ شعر ہی میں گم نہ ہو جا — فلک وہ ڈھونڈ جس کی یہ زمیں ہے
مرے فکرِ فلک پیما کی پرواز — ادب پروردۂ رُوح الامیں ہے
فراغ عشق و سوزِ آرزو سے — سخن میرا تب و تاب آفریں ہے
مگر میرے سخن کی روشنی بھی — ''چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے''
میرے اشعار میں پھنس کر نہ رہ جا — اگر تو سالکِ راہِ یقیں ہے
تری نظروں میں ہیں میری تصانیف — مری نظروں میں قرآنِ مُبیں ہے
گذر جانا مری بزم سخن سے — رہِ قرآں میں گامِ اولیں ہے
جو تو اس طرح قرآں تک پہنچ جائے — تو حاصل دولتِ دنیا و دیں ہے

محیطِ کائناتِ دل ہے قرآں
نظر کی آخری منزل ہے قرآں

ایم ایس ناز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام احمد پرویزؒ سے
علامہ اقبالؒ کے متعلق خصوصی انٹرویو

س: علامہ اقبال سے آپ کی پہلی اور آخری ملاقات کب اور کہاں ہوئی؟ صحبتیں جو گزر گئیں' ان کی یاد تازہ کیجئے۔

ج: پہلی ملاقات کے متعلق تو متعین طور پر نہیں کہہ سکتا کہ کب اور کہاں ہوئی؟ اس لئے کہ وہ تو پچاس سال سے بھی زائد کا عرصہ ہے' آخری ملاقات البتہ ان سے جنوری 1938ء میں ہوئی' جب یوم اقبال' کی تقریب کے سلسلے میں دہلی سے ہمارا قافلہ لاہور آیا اور ان سے ان کی قیام گاہ پر ملاقات ہوئی۔ اس زمانہ میں یوں کہئے کہ وہ گویا بستر مرگ پر رہی تھے۔ بینائی بھی بہت کمزور تھی' بولنے میں ان کو بڑی تکلیف ہورہی تھی' لیکن اس کے باوجود انہوں نے خاصا وقت ہمیں دیا۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ کچھ میری رعایت برتی' اس لئے کہ ہمارے صاحب کارواں علامہ اسلم جیراجپوری علیہ الرحمہ تھے' ان کے اکرام واحسان کی بدولت ہمیں بھی یہ سعادت نصیب ہوگئی۔ خاصا وقت اس میں صرف ہوا اور یہ آخری ملاقات ہے جو حضرت علامہ علیہ الرحمہ سے ہوئی۔ باقی رہے تاثرات' تو محترم سید نذیر نیازی صاحب نے اپنی کتاب ''اقبال کے حضور میں'' اس دن کی صحبت کا تفصیلی نقشہ پیش کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوجائے گا کہ ہم ان سے کس قسم کے سوال......؟

سوال تو میں نہیں کہہ سکتا' میری حیثیت تو ان کے سامنے ایک ادنیٰ سے متعلم کی رہی' ہم تو استفادہ ہی کرتے تھے' جرأت کر لیتے تھے کچھ پوچھنے کی' اگرچہ وہ بہت جرأت دلایا کرتے تھے' حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے' ان کا تو انداز ہی ایسا تھا' وہ کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ کوئی بڑی شخصیت ہیں اور ان کے سامنے کچھ چھوٹے لوگ بیٹھے ہیں' وہ تو سب کو برابر کی حیثیت دیتے تھے اور بعض اوقات تو انکسار اور بھی بڑھ جاتا تھا' جو ہم لوگوں کے لئے حوصلہ افزا ثابت ہوتا تھا۔

س: پرویز صاحب! اقبال کے حضور میں اس وقت کوئی ایسا موضوع بھی زیر بحث آیا ہو' جس کا ذکر نذیر نیازی صاحب نے اپنی کتاب میں نہ کیا ہو؟

ج: میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ سوال اس میں آ گیا ہے یا نہیں' لیکن دو باتیں بڑی اہم ہیں' حضرت علامہ نے 'جاوید نامہ' میں مختلف ارواح یا مختلف ہستیوں سے عالم بالا میں ملاقات کی جو روئداد بیان کی ہے' میرے نزدیک حضرت سید احمد شہید علیہ الرحمہ اور ان کا معرکہ بالاکوٹ' ہمارے اس آخری دور کی اسلامی تاریخ میں بڑا پرعظمت ہے' سو میں نے اس موقعہ پر حضرت علامہ سے عرض کیا کہ جی چاہتا تھا کہ آپ سرسید اور سید احمد شہید' دونوں کی ارواح کو آمنے سامنے لاکر ذرا اس کا تقابل

بتاتے۔اس پر حضرت علامہ نے فرمایا ''یہ اور اس قسم کے اور کئی سوال تھے جو بعد میں میرے ذہن میں آئے اور ایسا ہو جاتا ہے اب جب بھی مجھے فرصت ملی میں ان چیزوں کو ضرور سامنے لاؤں گا''۔

اور ایک سوال' میں نے یہ عرض کیا کہ یہ جو قیامت کا واقعہ یا حقیقت ہے وہ ہمارے ذہن میں تو ہے کہ ہم انسان ایک دن اللہ رب العزت کے حضور پیش ہوں گے' لیکن قرآن میں تو ہے کہ تیرا خدا اور اس کے ملائکہ یہاں آئیں گے تو کیا یہ سارا ماجرا یہاں ہی ہوگا؟

انہوں نے کہا کہ حیات بعد ممات اور وہاں کے جتنے بھی نظریات ہیں' ان سب کے متعلق میرے ذہن میں ہے اور میں قرآن کریم کی تفسیر کی (introduction) میں اس سوال کو موضوع سخن بناؤں گا۔

س: حضرت علامہ کی صحبت میں جو ان کے شیدائی بیٹھتے تھے' وہ کس قسم کے سوال کرتے تھے؟

ج: (مسکراتے ہوئے) یہ شیدائیوں کی بھی مختلف نوعیتیں اور قسمیں ہیں' آپ کا استفسار ہے کہ ان کے ہاں کس قسم کے لوگ بیٹھتے تھے؟ ان کی کیفیت تو بڑی دلچسپ ہے۔حضرت علامہ چونکہ ڈاکٹر مشہور تھے۔تو ایک دفعہ ایک شخص نے آ کر سوال کیا کہ میرے پیٹ کا درد بڑا پرانا ہے' کسی حکیم یا ڈاکٹر سے فائدہ نہیں ہوا' آپ مجھے کوئی اچھا سا نسخہ لکھ دیجئے۔

(قہقہہ لگاتے ہوئے) تو صاحب حضرت علامہ تو یہ بھی بتا دیا کرتے تھے۔اسی طرح مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ موچی دروازے کا ایک جفت ساز ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: ہمارا کاروبار پہلے خوب چلتا تھا' مگر جب سے انگریزی جوتے مارکیٹ میں آ گئے ہیں' ہمارا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گیا ہے' کسی نے ہمیں بتایا کہ علامہ صاحب بڑے اچھے مشورے دیتے ہیں' سو میں آپ سے مشورہ لینے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔

غرض کہ یہاں سے لے کر یورپ کے بڑے بڑے بلند پایہ مفکروں تک حضرت علامہ کی مجلس میں آیا کرتے تھے۔ہر کوئی اپنی اپنی ذہنی سطح' افتاد طبیعت اور مزاج کے مطابق سوال کرتا تھا اور اس کو اس کے مطابق ہی جواب ملتا تھا۔ادیب' شعراء' فلاسفر اور خود مولوی صاحبان (مسکراتے ہوئے) پیر پرست لوگ بھی۔کئی ایسے بھی تھے جو آ کر کہا کرتے تھے کہ حضرت کسی طرح سے آپ ڈاڑھی رکھ لیں' تو پھر دیکھیں کہ دنیا کیسے آپ کی گرویدہ ہو جاتی ہے۔شیدائیوں اور سوالات کی تو یہ کیفیت ان کی محفل میں ہوتی تھی۔

س: بعض لوگ حضرت علامہ کو ڈاڑھی رکھنے کا مشورہ دیتے تھے' لیکن حضرت علامہ نے ایسا نہیں کیا!

ج: علامہ اقبال ان سے کہا کرتے تھے کہ بھئی اس وقت تک عام تاثر یہ ہے کہ دین کے متعلق وہ ہی کچھ کہہ سکتا ہے یا جان سکتا ہے' جس کی ایک خاص شبیہہ ہو' خاص وضع قطع ہو' اور یہ ہمارا جو نیا طبقہ' نئی نسل یا نوجوان طالب علم ہیں ان کے دلوں میں یہ (Complex) سا پیدا ہو گیا ہے' میں اس (Complex) کو دور کرنا چاہتا ہوں' کہ نہیں' تم بھی دین کو سمجھ سکتے ہو' تمہیں بھی دین کے متعلق معلومات حاصل ہو سکتی ہیں اور اس کے لئے میں اپنے آپ کو بطور ایک مثال کے پیش کرنا چاہتا ہوں کہ دیکھئے میری وضع قطع ایسی نہیں ہے لیکن اس کے باوجود تم جانتے ہو کہ مجھے دین کے متعلق بہت کچھ معلوم ہے' یہ دنیا کہتی ہے

اور علماء کرام بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں، پس اس (Complex) کو نکال دو کہ جب تک تمہاری ایک خاص وضع قطع نہ ہو گی تم دین کا علم حاصل نہیں کرسکو گے یا دین کے متعلق کچھ نہیں جان سکو گے۔

س: اقبال کے افکار کی وسعت، ان کی بلندی اور ان کی گہرائی بے پایاں ہے۔ آپ نے علامہ کے افکار کے حوالے سے ان کی شخصیت کے کس پہلو کو زیادہ نمایاں طور پر محسوس کیا؟

ج: میں قرآن کا طالب علم ہوں اور قرآن ہی کی کشش سے میں حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے قرآن کریم کے متعلق جو کچھ کہا اس کا میرے دل پہ بڑا اثر تھا اور اثر یہ ہے کہ قرآن کریم کا سمجھنا میں نے حضرت علامہ سے سیکھا تھا۔ ان کی شخصیت کا یہی پہلو تھا جو مجھے ان کے قریب لے آیا۔ انہوں نے اپنی پہلی تصنیف ''اسرار خودی'' یا ''رموز بیخودی'' کے آخر میں کہا ہے کہ جو کچھ میں نے سمجھا ہے، اپنی بصیرت کے مطابق قرآن ہی سے سمجھا ہے۔ قرآن کریم کی عظمت اور اس کا احترام میرے دل میں بھی چونکہ بدرجہ نہایت تھا، اس لئے میں جو ان کے قریب ہوا، تو اس کی یہی وجہ تھی۔ باقی چیزیں وہ قرآن کے تابع رکھتے تھے مثلاً دنیا بھر کے علوم پر ان کی نگاہ تھی، لیکن کسی علم یا مذہب کے متعلق جو بحث بھی وہ چھیڑتے، آخر میں وہ قرآن کی طرف آجاتے اور فرمایا کرتے تھے کہ قرآن اس کے متعلق یوں کہتا ہے۔ میرے نزدیک ان کی شخصیت کا سب سے نمایاں اور جاذب پہلو ان کی یہ بصیرت قرآنی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر ان کی شخصیت کو سمٹایا جائے، تو ان کے افکار کی وسعت، ان کی بلندی اور ان کی گہرائی، سب کچھ اس میں سمٹ کر آجاتا ہے۔

س: علامہ ایک مستقل نظام فکر رکھنے والے معاشرہ کی تشکیل چاہتے تھے، ان کے نزدیک اس مثالی معاشرے کے خدوخال کیا تھے؟

ج: ہاں، یہ وہ سوال ہے جس میں حضرت علامہ کا سارا پیغام سمٹ کر آجاتا ہے۔ درحقیقت قرآن سے پہلے پوری دنیا میں مذہب کے متعلق تاثر، خیال اور عقیدہ یہ تھا کہ یہ خدا اور بندے کے درمیان ایک نجی تعلق (Private Affair) کا نام ہے جو پوجا پاٹھ، پرستش، بندگی اور عبادت کے ذریعے سے قائم ہوتا ہے یا مراقبوں اور ریاضتوں کے توسل سے، دنیاوی معاملات سے ان کا کوئی تعلق نہیں، مگر قرآن حکیم نے آ کر اس کی تردید کی اور بتایا کہ نہیں، ایسا ہرگز نہیں، ضمناً مذہب کا لفظ تو قرآن میں ہے ہی نہیں، اس میں دین کا لفظ ہے، ہماری یہ بدبختی ہے کہ قرآن حکیم یا عربی زبان کے یہ جو الفاظ ہیں، ان کے مترادفات دنیا کی کسی بھی زبان میں نہیں ہیں، جب ہم ان کا ترجمہ کرتے ہیں تو ان زبانوں میں جو (Concepts) یا تصورات ہوتے ہیں وہیں سے ہم یہ الفاظ لیتے ہیں، اس لئے ہم نے دین کا مترادف مذہب (Religion) لیا۔ جو صحیح نہیں ہے۔ قرآن یا اسلام درحقیقت مذہب کے خلاف ایک چیلنج ہے۔ حضرت علامہ بھی جو کتاب لکھنا چاہتے تھے اور جس کے لئے وہ (Notes) چھوڑ گئے، انہوں نے ایک فقرے میں یہ کہا ہے کہ:

''اسلام (Religion) کے خلاف (Protest) ہے''

صد حیف کہ اقبال وہ کتاب لکھ نہ سکے۔ میں یہ کہنے کی جسارت تو نہیں کرسکتا کہ میں نے ان کے موضوع کو اپنایا، بہرکیف

یہ ان ہی کا فیضان ہے کہ میں نے Islam, A Challenge to Religion لکھی۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام مذہب کے خلاف ایک چیلنج تھا۔ مذہب کا جو تصور (Concept) رہا ہے کہ دنیوی معاملات سے اس کا کوئی تعلق نہیں' قرآن نے اس کو غلط ثابت کیا ہے۔ بنابریں وحی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیوی امور کو ابدی اقدار کے تابع رکھ کر حل کرے۔ حضرت علامہ نے اسے ایک مصرعہ میں یوں سمودیا ہے کہ

از کلید دیں درِ دنیا کشاد

دین کی چابی سے دنیا کے ہر دروازے کو کھولا جا سکتا ہے اور یہی ہے دین اسلام کا کام' قرآن نے ہمیں یہی سکھایا ہے۔ اب جہاں تک دنیوی امور کا تعلق ہے' ان میں مملکت کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ دنیوی امور دراصل مملکت ہی کے ذریعے طے پاتے ہیں' گویا اسلام وہ ہے جس میں مملکت اقدار خداوندی کے تابع رہ کر دنیوی معاملات کا حل پیش کرتی ہے اس میں مذہب اور سیاست الگ الگ نہیں رہتے بلکہ ایک ہو جاتے ہیں۔ حضرت علامہ اس بارے میں اتنے محتاط تھے کہ انہوں نے لکھا ہے:

''میں تو یہ کہوں گا اور تمہیں یہ بھی نہیں کہنا چاہئے کہ: یہ ایک حقیقت کے دو رخ ہیں''۔

مقصود حضرت علامہ کے کہنے کا یہ تھا کہ دو رخ ہونے میں بھی کچھ ثنویت (Dualism) کا تاثر آ جاتا ہے اس لئے کہ ؎

گھر میں آب گہر کے سوا کچھ اور نہیں

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ میں عرض کروں گا کہ جب اسلام میں ملوکیت در آئی تو اس نے آ کر پھر یہ ثنویت پیدا کر دی۔ مملکت' سلطنت اور دنیا کے معاملات حکومت نے اپنے پاس رکھ کر ایک الگ دائرہ قائم کر لیا۔ مذہب کے معاملات انہوں نے علماء کو دے دیئے' اس طرح سے دو علیحدہ علیحدہ مملکتیں قائم ہو گئیں' جنہوں نے باہم معاہدہ کر لیا کہ وہ ایک دوسرے کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کریں گے۔ اس طریق کار سے وہ تصور ابھر آیا' جو اسلام سے پہلے رائج تھا اور جس کو مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ ہمارے ہاں ہزار برس سے یہی تصور چلا آ رہا تھا' ثنویت چونکہ حکومت اور مذہبی پیشوائیت دونوں کے لئے مفید تھی' اس میں دونوں کو الگ الگ اقتدار کے دوائر حاصل تھے' اس لئے حکومت نے تو اس کو مستحکم سے مستحکم تر کرنا ہی تھا' مذہب پرست طبقے نے بھی ہمارے ہاں ان گروہوں کو اور زیادہ مضبوط کیا' چنانچہ کیفیت یہ ہو گئی کہ اذہان نے اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ مملکت اور مذہب یکجا ہو سکتے ہیں' حضرت علامہ کا یہ زندہ جاوید کارنامہ تھا کہ انہوں نے فرمایا۔

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

حضرت علامہ واشگاف انداز میں فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کی رو سے اسلام ایک نظام زندگی ہے' ایک ضابطہ حیات ہے' جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں کو مستنیر کرتا ہے۔ عبادت' مناصب اور امور مملکت کو اس سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور یہ اسی صورت میں زندہ ہو سکتا ہے کہ اپنی ایک آزاد مملکت ہو۔

س: حضرت علامہ کے ذہن میں کس قسم کے مستقل نظام کا نقشہ تھا؟

ج: وہ ابدی حقائق، اصول یا اقدار، جو خدا کی طرف سے ودیعت کئے گئے، وہی مستقل اور غیر متبدل ہیں۔ حضرت علامہ نے یہ تصور دیا تھا کہ آپ ان مستقل اقدار کو بطور حدود کے لیجئے، یہ غیر متبدل رہیں گی۔ ان حدود کے اندر رہ کر بھی زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزوی قوانین یا اس کے جزوی پروگرام کی جزئیات، ہر دور کی امت باہمی مشاورت سے خود متعین کرے گی، اس طرح سے یہ غیر متبدل اور تغیر کے امتزاج سے زمانے کے ساتھ ساتھ بلکہ زمانے کی امامت کرتا ہوا نظام آگے بڑھے گا۔ مستقل نظام کی یہ ایک شکل ان کے ذہن میں تھی۔ اقبال، قرآن حکیم کو اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب سمجھتے تھے، ان کا ایمان تھا کہ اس کتاب کو قیامت تک کے لئے محفوظ رکھا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن قیامت تک امت کی ہر سیاست، مملکت اور امورِ دنیا کا ایک دستورِ اساسی رہے گا، اس اعتبار سے یہ ایک مستقل نظام ہوا، لیکن جو اس کی جزئیات ہیں، وہ زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتی چلی جائیں گی۔ بالفاظ دیگر مستقل اور تغیر پذیر عناصر کے امتزاج سے یہ نظام بنتا ہے۔ مستقل نظام کا یہی نقشہ حضرت علامہ کے ذہن میں تھا۔ یہ تصور انہوں نے قرآن سے لیا اور یہی قابل عمل تصور تھا۔ اقبال چاہتے تھے کہ برصغیر میں مسلمانوں کی ایک الگ مملکت ہو، جس میں اس نظام کو نافذ کریں اور اس کی جزئیات کو ممکن العمل بنائیں، اور اس کے جو انسانیت ساز نتائج ظہور پذیر ہوں، انہیں دیکھ کر پہلے مسلمان مملکتیں غالباً اور اس کے بعد دنیا کی دوسری اقوام بھی اس کی طرف لپک کر آجائیں گی۔

س: اقبال کے ذہن میں اسلامی نظام کا کیا تصور تھا؟

ج: اس زمانہ میں سب سے بڑا اعتراض یہ پیدا ہوا تھا کہ مسلمانوں میں اس قدر فرقے ہیں جن کی موجودگی میں ایک اسلامی مملکت، ایک اسلامی نظام یا ایک اسلامی دستور پر متفق ہونا کیسے ممکن ہے؟ علامہ اقبال اس کے جواب میں فرماتے تھے:

''ٹھیک ہے، فرقوں کی موجودگی میں جانتا ہوں، لیکن ان سب کے اندر قرآن ایک قدر مشترک ہے؟ اگر ان کی اساس قرآن ہوگی، تو اس سے کوئی بھی انکار نہیں کرے گا''۔

''فکری روابط کی بڑی اہمیت ہے، ان حضرات (ائمہ کرام جنہوں نے فقہ مرتب کی) نے اپنے اپنے وقت میں بڑا کام کیا ہے۔ میں اس کی قدر کرتا ہوں، لیکن اس تمام ہمہ گیری کے باوجود یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں، اس لئے انہیں حتمی اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے''۔

حضرت علامہ کہتے تھے کہ یہ پچھلے حالات تھے، مگر اب حالات بدل چکے ہیں اور دنیائے اسلام ان تمام نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے، جو زندگی کے مختلف گوشوں میں فکر انسانی کی نشوو ارتقاء سے وجود میں آگئی ہیں، اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔ اس لئے انہوں نے کہا کہ:

''خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عمل ارتقاء ہے، اس کی مقتضی ہے کہ۔۔۔''۔

یہ ہیں وہ الفاظ جو بڑی اہمیت رکھتے ہیں:

''ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی

سرمایہ سے رہنمائی لے سکتی ہے' لیکن اسلاف کے فیصلے اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتے۔''

حضرت علامہ اقبال کے چھٹے خطبے میں' جس کا ایک اقتباس میں نے سنایا ہے' اس کی تفصیل ملتی ہے۔ یہی وہ عملی طریق یا پروگرام ہے' جس کی رو سے وہ اس سرزمین کو اسلامی نظام کا گہوارہ دیکھنے کے متمنی تھے۔

س: اقبال نے جس جہانِ نو کا خواب دیکھا تھا۔ کیا ہم اس کے مطابق صحیح رخ پر آگے بڑھے ہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ اس خواب کو حقیقت میں بدلنے کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہئے؟

ج: پیش رفت تو درکنار' ہم بہت پیچھے چلے گئے ہیں جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہے کہ 1930ء میں جب حضرت علامہ نے یہ تصور پیش کیا تو کہیں سے کوئی آواز نہ اٹھی تھی۔ 1938ء سے 1940ء تک قائداعظم جب اس تصور کو لے کر آگے بڑھے تو بیم ورجا کا عالم تھا' اس زمانے میں مخالفت کچھ سطحی سی تھی اس کے بعد جب یہ تصور عملی صورت اختیار کرنے لگا تو مخالفت نظریاتی ہوتی چلی گئی اور اس میں تندی و تیزی اور تلخی بھی آتی چلی گئی۔ بالآخر پاکستان معرض وجود میں آ گیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مملکت کیا تھی؟ یہ تصور کیا تھا؟ یہ عمل کیا تھا؟ یہ عمل' یہ تصور اور یہ مملکت ثنویت کو مٹانے کے لئے تھی۔ پاکستان میں اقبال کے تصور کا اسلامی نظام اسی صورت میں قائم ہو سکتا تھا کہ یہ ثنویت باقی نہ رہتی۔

اس میں کلام نہیں کہ اسلام کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر حکمرانی کا حق نہیں دیتا' اقتدار کی کوئی بھی شکل ہو' اسلام انسانوں پر اقتدار کو ختم کر دیتا ہے۔

اگر پاکستان میں اقبال کے تصور کی مملکت معرض وجود میں آ جاتی تو مذہبی پیشوائیت کی یہاں کوئی گنجائش نہ رہتی' حکمران طبقے نے اپنے دور کے سیکولر نظام یہاں رائج کئے۔ نام تو سارے اسلام کا لیتے رہے' کیونکہ اسلام کے نام پر دس سال بلکہ اس سے بھی زیادہ یعنی 1930ء سے جنگ لڑی تھی' اب یہ کس طرح ممکن تھا کہ یہ لوگ اسلام کا نام لئے بغیر اپنے مقاصد کو عملی جامہ پہنا سکتے۔

یہاں مجھے اجازت دیجئے کہ درمیان میں کہیں ''میں'' آ جائے' جس سے میں ہمیشہ گریز کرتا رہا ہوں' میں طبعاً کچھ ایسا واقع ہوا ہوں' لیکن بعض دفعہ؟ ؎

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

افسوس' اقبال نے جس جہان نو کا خواب دیکھا تھا' وہ پورا نہ ہو سکا۔ مگر میں مایوس نہیں ہوں۔ اقبال نے وہی کچھ کہا جو قرآن نے کہا ہے اور ہمارا تو ایمان ہے کہ اس نظام (اسلام) نے دنیا کے ہر نظام پر غالب آ کر رہنا ہے۔ اگر ہم شروع ہی سے نوجوان طبقے بالخصوص طلباء کے نصاب ہی سے اقبال کو لازم کر دیتے تو آج ہمیں قنوطیت کا شکار نہ ہونا پڑتا۔ اب بھی اگر یہ انتظام ہو جائے تو اقبال کا تصور نئی نسل کے رگ و ریشے میں سما سکتا ہے۔ میں تو اقبال کے اس تصور کو' اس پیغام کو عام کرتا رہوں گا' یہ میرے ایمان کا جزو ہے' یہ میرے دین کا فریضہ ہے۔ آخر میں' میں عرض کروں گا کہ علی گڑھ یونیورسٹی قائم ہوئی' تو پاکستان کی مملکت معرض وجود میں آ گئی' اگر یہاں بھی ایک ایسی درسگاہ قائم ہو جائے اور اقبال کے تصور کو نصاب کا حصہ بنا دیا جائے' تو اقبال نے جس جہان نو کا خواب دیکھا تھا' وہ شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے۔ (ہاں) ۔ حضرت علامہ نے فرمایا تھا۔

''زود یا بدیر یہ سوال مسلم اقوام کے سامنے آنے والا ہے کہ اسلامی قوانین شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں؟ اصل مسئلہ یہ ہے۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی' اس سوال کا جواب یقیناً اثبات میں ہونا چاہیئے' بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے''۔

اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اقبال کے پیغام اور ان کی فکر کو عام کرنے کے لئے ہم کہاں تک آگے بڑھے ہیں؟ اور اگر نہیں بڑھے تو کس سمت کو جا رہے ہیں۔ درحقیقت مخالفینِ اقبالؒ کی خواہش ہے کہ ؎

ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

اس دور میں جس کو شرعِ پیغمبری یا نظامِ اسلامی کہا جا سکتا ہے وہ تو اقبال کے تصور سے پیدا ہوتا ہے' (اور اب) ہم آہستہ آہستہ وہاں تک پہنچ گئے ہیں کہ مذہبی پیشوائیت جس کا دائرہ ابتداء میں مذہب تک محدود تھا اب سیاست میں بھی در آیا ہے' حالت یہ ہو گئی ہے کہ ہم آگے نہیں بڑھے' بلکہ بہت پیچھے چلے گئے ہیں' اور ہماری یہ کیفیت تاریخ کے کسی دور میں بھی نہیں ہوئی کہ مذہب پرست طبقہ سیاست کے اوپر آکر حاوی ہو جائے۔

س: کیا یہ بات نہیں کہ اقتدار ہمیشہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں رہا' جو مذہب سے بیگانہ تھے اور صرف سیاست جانتے تھے؟ اس لئے اگر یہ تجربہ بھی دیکھ لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے؟

ج: مگر میری ذاتی رائے میں اگر انتخابات میں ایسا ہوا' تو ہو سکتا ہے' مذہبی طبقہ اس فکر میں ہے کہ اقبالؒ کی فکر آگے نہ آئے۔ حکمران طبقوں کے مفاد میں بھی یہ بات ہے کہ سیکولر نظام ہی رہے۔ سرمایہ دار طبقہ کی بھی یہی خواہش ہے' کیونکہ یہ ان کے مفاد میں ہے' اقبال اور قرآن سرمایہ داری کے مخالف ہیں۔ (یہ سب گروہ) فکر اقبال کے مخالف ہیں کیونکہ یہ طبقے نہیں چاہتے کہ یہاں سلامی نظام رائج ہو جائے۔

س: تو پھر اقبال کی فکر کو عام کون کرے گا؟

ج: جس کو جرأت نصیب ہو گی' وہی اقبال کی فکر کو عام کرے گا۔ ایسی جرأت جو اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر فاروقؓ کو بخشی تھی' بقول اقبال:

''وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے وہ جسے رسول اللہ صلعم کی حیات طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے''۔

جرأت کے فقدان کے بغیر اقبال کا تصور یا پیغام عام نہیں ہو سکتا۔ جرأت کے بغیر یہ تصور' یہ پیغام یا تو شاعری ہو جائے گا یا پھر قوالوں کی ڈھولک پر گایا جائے گا۔

(بشکریہ فکر و نظر' اسلام آباد' نومبر' دسمبر 1977ء)

غلام احمد پرویزؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ دلنواز

تحریکِ طلوعِ اسلام، ملک کی وہ واحد شمعِ فروزاں ہے جو مفکرِ قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ کے ہاتھوں روشن ہوئی اور جس نے اکنافِ عالم میں نورِ قرآنی کی ضیاء پاشیوں کو عام کرنے کا ذمہ اٹھا رکھا ہے۔

مفکرِ قرآن علیہ الرحمۃ کی وفات کے بعد، اس شمعِ قرآنی کے علمبرداروں نے جس خلوص، لگن، جانفشانی اور ان تھک محنت سے اس تحریک کو مزید وسعتوں سے ہمکنار کیا، اس کے اثرات نے جہاں وابستگانِ دامنِ قرآنی کے لئے ہزار مسرتوں اور شادمانیوں کے سامان فراہم کئے، وہیں کچھ عناصر ان سے یوں آتش زیر پا ہوئے کہ انہوں نے اس تحریک اور اس کے منتظمین کے بارے میں کئی قسم کی بدگمانیوں کی وسیع پیمانے پر تشہیر شروع کر دی۔

ہمیں یقین ہے کہ وابستگانِ تحریک، قرآن کریم کی اُس تعلیم کے صدقے جسے مفکرِ قرآن زندگی بھر عام کرتے رہے، اتنی سمجھ بوجھ رکھتے ہیں کہ ان حاسدینِ تحریک کے دام ہائے ہمرنگِ زمین کے فریب میں نہیں آئیں گے کیونکہ یہ سب، تمام تر مخالفانہ پراپیگنڈہ کے علی الرغم، تحریک کے فروغ اور تقدم کا مشاہدہ اپنی چشمِ بینا سے بذاتِ خود کر سکتے ہیں۔

کچھ ایسے ہی حالات، مفکرِ قرآن کی اپنی زندگی میں بھی (1964ء میں) ان کے لئے وجۂ پریشانی خاطر ہوئے تھے جن کی بنا پر انہوں نے مندوبینِ طلوعِ اسلام کنونشن 1964ء کو اپنی منفرد قرآنی بصیرت کی روشنی میں ''حرفِ دلنواز'' کے عنوان سے خطاب فرماتے ہوئے وابستگانِ تحریک کو ایسے عناصر کی ریشہ دوانیوں سے خبردار کیا اور ان سے مجتنب رہتے ہوئے اپنے مشن کے مقاصد کے حصول کے لئے اپنی مساعی کو تیز تر کرنے کی تلقین کی تا کہ نوعِ انسانی کو بتایا جائے کہ اس کی مشکلات کا حل قرآن کی بارگاہ کے سوا کہیں اور سے نہیں مل سکتا۔

ادارہ اُن کے اس خطاب کو، بلاکم و کاست، بارِ دگر پیش کرتے ہوئے احباب سے اسی احتیاط اور توجہ کی توقع رکھتا ہے۔ جس سے انہوں نے مفکرِ قرآن کی ندائے دردمند پر لبیک کہا تھا۔

نُورِ خدا ہے کُفر کی حرکت پہ خندہ زن پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

وَاللهُ الْمُسْتَعَانُ (12:18)

(بحوالہ طلوعِ اسلام، اکتوبر 1989ء)

زمیلانِ قافلہ قرآنی!

آپ پر ہزار ہزار سلام ورحمت ہو۔

میرا سرِ نیاز‘ بارگاہِ ایزدی میں سجدہ ریز ہے کہ اس نے ایک بار پھر موقعہ بہم پہنچایا کہ خمخانۂ قرآنی کے بادہ نوش‘ اپنے سروں میں کیفِ صہبائے حجازی کی خرد فروزیاں‘ اور اپنے دلوں میں‘ فطرتِ روح الامینی کی سکون آمیزیاں لئے‘ وجۂ شادابیٔ محفل ہوئے ہیں۔ اس دَور میں‘ جبکہ کشاکشِ حیات ایسی شدید‘ اور غمِ دوراں اس قدر گراں نشیں ہورہا ہے‘ اس قسم کے فرصت کے چند لمحات کا میسر آ جانا‘ جن میں کسی کی نشیدِ جانفزا پکار پکار کر کہہ رہی ہو کہ۔

اس کی محفل میں بیٹھ کر دیکھو زندگی کتنی خوبصورت ہے

از بس مغتنمات میں سے ہے۔ آیئے ہم‘ ان چند لالہ رنگ ونشاط آہنگ ساعتوں میں‘ جنہیں ہم نے سورج کی کرنوں سے نچوڑ کر اپنی مٹھی میں دبا رکھا ہے‘ خدائے عظیم کی اُس کتاب جلیل کا تذکرۂ حسین وجمیل کریں جس کے متعلق صبحِ بہارِ کائنات کی ہر رنگینی کا تبسمِ پنہاں‘ اس رازِ فطرت کی غمازی کررہا ہے کہ

یہ غنچوں کی رنگت‘ یہ پھولوں کی نکہت اسی کا تبسم‘ اسی کے اشارے

اور قدح برداران ساقیٔ کوثر وتسنیم‘ انتہائی جذب وکیف کے عالم میں‘ ایک دوسرے سے کہہ رہے ہیں کہ

دوستو! اُس چشم ولب کی کچھ کہو جس کے بغیر گلستاں کی بات رنگیں ہے‘ نہ میخانے کا نام

ایک خطرناک گروہ:

میرے عزیز رفیقو! ہم آج قریب ڈیڑھ سال کی طویل مدت کے بعد‘ مل رہے ہیں۔ اس دوران میں کچھ میری مسلسل علالت‘ اور کچھ دیگر نامساعد حالات کی وجہ سے‘ جن کے تذکرۂ جگر سوز سے میں آپ کی اس محفلِ کیف ونشاط کو افسردہ و پژمردہ نہیں کرنا چاہتا‘ ہماری تحریک قدرے نرم رو ہوگئی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہم اب اس وادیٔ پُرخار سے آگے نکل آئے ہیں‘ اس لئے اب ہم اپنے نئے عزائم اور تازہ ولولوں سے‘ بتوفیقِ ایزدی‘ اس کمی کو جلد پورا کرلیں گے۔ لیکن‘ برادرانِ گرامی قدر! قبل اس کے کہ ہم اپنا سامانِ سفر تازہ کرکے پھر جادہ پیمائے منزل ہوں‘ ضروری ہے کہ ہم قرآن کی شمع نورانی کی روشنی میں اپنے گرد وپیش کا جائزہ لیں اور دوسری طرف خود اپنا احتساب کریں۔۔۔ اس لئے کہ جو راہ رؤِ سفرِ زندگی میں احتسابِ خویش نہیں کرتے اور گرد وپیش پر نگاہ نہیں رکھتے‘ وہ اپنے آپ کو رہزنوں کی تاراج سے محفوظ اور کیسہ تراشوں کی چابکدستیوں سے مامون تصور نہیں کرسکتے۔ رہروانِ سفرِ حیات کی نگاہیں بالعموم ان مخالفین کی طرف اٹھتی ہیں جو للکار کر سامنے آتے اور پکار کر حملہ کرتے ہیں لیکن قرآن کریم ان کھلے دشمنوں سے کہیں زیادہ نقصان رساں اور تباہ کن ان فتنہ پرور عناصر کو قرار دیتا ہے جو رفاقت کے نقاب میں اس قافلہ میں شامل ہوں۔ خدمت وایثار کے بہروپ میں اپنے ساتھیوں کا اعتماد حاصل کریں اور انتہائی

نازک مرحلہ پر ان کی متاعِ حیات پر شبخون ماریں۔ آپ دنیا کی تاریخ۔۔۔ اور انتہائی ندامت سے' سر جھکا کر کہنا پڑتا ہے کہ خود مسلمانوں کی تاریخ۔۔۔ پر نگاہ ڈالیں۔ آپ دیکھیں گے کہ کسی تحریک کو غیروں کے ہاتھوں اس قدر نقصان نہیں اٹھانا پڑا جس قدر تباہی کا موجب خود ''اپنوں'' کی فتنہ سامانیاں بنی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم' اپنے اولیں اوراق میں' ان دو جماعتوں کے اجمالی تذکرہ کے بعد' جو کھلے بندوں اس کی دعوت پر ایمان لاتیں یا دھڑلے سے اس کی مخالفت کرتی ہیں' اس گروہ کا ذکر تفصیل سے کرتا ہے جن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

مَنۡ يَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَمَا هُمۡ بِمُؤۡمِنِيۡنَ (2:8)

وہ دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ وہ مومن ہیں لیکن درحقیقت وہ مومن ہوتے نہیں یہ ان کا صرف زبانی دعویٰ ہوتا ہے۔ ان میں سے کچھ تو وہ ہوتے ہیں جو اس جماعت کے اندر داخل ہوتے ہی تخریب کے لئے ہیں' اور کچھ ایسے جو اپنے خاص مقاصد لے کر ان کے ساتھ شامل ہوتے ہیں۔ ان کے متعلق کہا ہے کہ یہ اپنی دانست میں ''خدا اور جماعتِ مومنین کو دھوکا دیتے ہیں''، لیکن درحقیقت۔ وَمَا يَخۡدَعُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَهُمۡ وَمَا يَشۡعُرُوۡنَ (2:9)۔ وہ خود اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت کو سمجھتے نہیں۔ اس لئے کہ وہ جذبات کی رو میں بہے چلے جاتے ہیں اور جب انسان پر جذبات غالب آ جائیں تو اس کی عقل و فکر ماؤف ہو جاتی ہے۔

نفسیاتی مرض:

قرآن کہتا ہے کہ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ ان کے دلوں میں روگ ہوتا ہے۔ یہ نفسیاتی مریض ہوتے ہیں۔ نفاق درحقیقت نفسیاتی مرض ہے جس سے انسان اپنے آپ کو دھوکے میں رکھتا ہے اور بظاہر سمجھتا یہ ہے کہ وہ بالکل صحیح راستے پر چل رہا ہے۔ (اس مرض کی تفصیل ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی)۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ لَا تُفۡسِدُوۡا فِى الۡاَرۡضِ۔ تم تخریبی کارروائیاں مت کرو۔ خواہ مخواہ فساد پیدا نہ کرو۔ تو یہ جواب میں کہتے ہیں کہ اِنَّمَا نَحۡنُ مُصۡلِحُوۡنَ۔ یہ کیا کہا آپ نے! ہم فساد پیدا کرتے ہیں؟ ہمارے جیسا اصلاح کرنے والا اور کون ہے۔ ہماری ہر تدبیر معاملات کو سنوارنے اور اس تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے ہے۔ فساد تو وہ پیدا کر رہے ہیں جو ہماری مخالفت کرتے ہیں۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اٰمِنُوۡا كَمَاۤ اٰمَنَ النَّاسُ اگر تم اصلاح کرنے کا ارادہ رکھتے ہو تو پھر ان لوگوں جیسی روش اختیار کرو جو اس تحریک کے ساتھ ہیں۔ تو ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ یہ تو شخصیت پرستوں کا گروہ ہے جو اندھی عقیدت میں بہے چلے جا رہے ہیں' ہم ان جیسے احمق تھوڑے ہیں۔ اور قرآن کا جواب یہ ہوتا ہے کہ اَلَاۤ اِنَّهُمۡ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰـكِنۡ لَّا يَعۡلَمُوۡنَ (2:10-13) یاد رکھو! سب سے بڑے احمق یہ خود ہیں۔ لیکن اس بات کو سمجھتے نہیں' اس لئے کہ یہ جذبات سے کام لیتے ہیں۔ علم و عقل سے نہیں لیتے۔

کاروباری ذہنیت

سوال یہ ہے کہ یہ لوگ کون ہیں اور کیوں ایسا کرتے ہیں' قرآن نے دو آیتیں آگے جا کر اس سوال کا نہایت واضح

جواب دیا ہے۔ اور وہ یہ کہ فما ربحت تجارتھم۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس تحریک میں کاروباری ذہنیت لے کر داخل ہوئے تھے۔ بس اس ایک نقطہ میں ساری تفصیل سمٹ کر آ جاتی ہے۔

قرآنی تحریک کی پوری عمارت للٰہیت کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ للٰہیت کے معنی یہ ہیں کہ اس میں داخل ہونے والے کے سامنے صرف ایک مقصد ہو۔ یعنی اس دعوت اور تحریک کا فروغ اور کامیابی اور اس کے ذریعے سے اپنی اصلاحِ نفس۔ اس میں شامل ہونے والے کی ذہنیت یہ ہونی چاہئے کہ: اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ (6:162-163) میرے فرائض منصبی اور ان کی بایں حسن وخوبی ادائیگی یہ میرا تمام کاروبارِ حیات۔ میری زندگی اور میری موت۔ سب اس پروگرام کی تکمیل کے لئے ہے جو اس دعوت الی الحق کے سلسلہ میں مرتب کیا گیا ہے اس کے علاوہ کوئی اور مقصد میرے پیش نظر نہیں۔ اگر اس مقصد کے علاوہ کوئی اور جذبہ دل میں بیدار ہو گیا تو وہ للٰہیت نہ رہی۔ سودا بازی ہو گئی۔ یہی وہ سودا بازی ہے جس کے لئے مفاد پرست لوگ قرآنی تحریک میں شامل ہوتے ہیں۔ جب تک وہ دیکھتے ہیں کہ اس کے ساتھ رہنے میں ان کا فائدہ ہے، وہ اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ جب اس فائدے پر زد پڑتی ہے تو اس سے علیحدہ ہو جاتے ہیں اور اس علیحدگی کے وقت ان کے دل کا روگ ابھر کر سامنے آ جاتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں یہ لوگ اس تحریک کے لئے مہیب خطرہ اور تخریب کا موجب بن جاتے ہیں۔ علیحدگی کے وقت وہ اس کا اعتراف تو کسی حالت میں نہیں کرتے کہ ہم ہی میں کچھ نقائص اور کمزوریاں تھیں جن کی وجہ سے ہم اس تحریک کے ساتھ نہیں چل سکے۔ اس قسمکے اعتراف کے لئے بڑی جرأت کی ضرورت ہوتی ہے۔ (اگر ان میں جرأت ہوتی تو یہ منافق ہوتے ہی کیوں، یہ یا کھلے بندوں مومن ہوتے یا نکھرے ہوئے کافر۔ بین بین کی راہ تو اختیار ہی وہ کرتا ہے جو جرأت وبسالت سے عاری ہو۔ یاد رکھئے۔ کاروباری ذہنیت اور جرأت دو متضاد عناصر ہیں جو ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے)۔ یہ لوگ اپنی کسی کمزوری کا اعتراف نہیں کرتے۔ اب دوسری صورت یہی باقی رہ جاتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کریں۔ وہ ایسا اسی شکل میں کر سکتے ہیں کہ وہ اس تحریک میں کیڑے ڈالیں۔ اس کے ساتھ وابستہ رہنے والوں کو بدنام کریں۔ اس کے داعیان کے خلاف الزام تراشی کی مہم شروع کر دیں۔ ان پر ذاتی حملے کریں۔ دنیا میں کہتے پھریں کہ ہم تو نہایت نیک نیتی سے اس تحریک میں شامل ہوئے تھے لیکن اندر جا کر معلوم ہوا کہ یہ سب دھوکا اور فریب ہے۔ اب جب ہم پر حقیقت حال منکشف ہو گئی ہے تو دیانتداری کا تقاضا ہے کہ ہم ان کا ساتھ چھوڑ دیں اور صحیح واقعات کی تشہیر کریں تا کہ دوسرے لوگ ان کے فریب میں نہ آ سکیں۔ وہ یہ مہم شروع کر دیتے ہیں اور چونکہ سننے والے اتنی تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ جو کچھ سنا ہے اس کی تصدیق تو کرا لی جائے، ان کا پروپیگنڈا کامیاب ہو جاتا ہے۔

اس کا مفاد کیا ہوتا ہے:

اس مقام پر ایک نہایت اہم اور نازک سوال سامنے آتا ہے اور جب تک اسے سمجھ نہ لیا جائے، کاروباری ذہنیت کا صحیح اندازہ لگایا نہیں جا سکتا۔ ایک شخص قرآنی تحریک میں شامل ہوتا ہے۔ اپنی گرہ سے روپیہ خرچ کرتا ہے۔ دن رات اس کے

کاموں میں لگا رہتا ہے۔ وقت اور توانائی صرف کرتا ہے۔ اغیار کے طعنے بھی سنتا ہے۔ اور اس کے معاوضے میں اسے کچھ نہیں ملتا۔ نہ ہی کچھ ملنے کی توقع ہوتی ہے۔ جب وہ تحریک سے الگ ہوتا ہے تو اس چیز کو اپنی وفا شعاری اور خلوص وصداقت کے لئے بطور ثبوت پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بتایئے کہ اگر مجھ میں خلوص نہیں تھا تو میں نے اتنا عرصہ اس قدر کام اور ایثار کیوں کیا؟ یہ بات بظاہر اس قدر وزنی نظر آتی ہے کہ لوگ اس کے قائل ہو جاتے ہیں اور وہ یوں اپنے تخریبی مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔لیکن قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ للّٰہیت کے مقابلہ میں انسان کے پیشِ نظر مالی مفاد ہی نہیں ہوتے۔ اکثر و بیشتر ایک ایسا مقصد ہوتا ہے جس کے سامنے مال و دولت اور جاہ و منصب سب ہیچ ہوتے ہیں۔لیکن وہ مقصد کسی کو نظر نہیں آتا۔

ایغو کی تسکین

اسی کو وہ دل کا روگ یہ نفسیاتی مرض قرار دیتا ہے۔ اسے وہ ''عزت الاثم'' سے تعبیر کرتا ہے۔ دورِ حاضر کے علم النفس (سائیکلوجی) کی اصطلاح میں اسے (Egoism) کہا جاتا ہے۔ جو حضرات انسانی نفسیات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ بیماری کس قدر شدید، گہری اور خوفناک ہوتی ہے، اور اس کے نتائج کس قدر تباہ کن۔ ایغو، انسان کے پندارِ نفس کو کہتے ہیں۔ یعنی بڑا بننے کی ہوس۔ ایک شخص کو آپ دیکھیں گے کہ وہ جیب سے روپیہ بھی صرف کرتا ہے اور پھر اجتماعات میں بیٹھا کبھی جھوٹے برتن صاف کر رہا ہے۔ کبھی جھاڑو دے رہا ہے۔ دریاں بچھا رہا ہے۔ کرسیاں اٹھا رہا ہے۔لیکن مقصد اس سے صرف یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس کی تعریف کریں اور اس طرح وہ ان کی نگاہوں میں بڑا بن جائے۔ اس سے اس کا نفس موٹا ہوتا ہے۔ اس کے پندار کی تسکین ہوتی ہے۔ جب تک ایسا ہوتا رہے وہ اپنے آپ کو اس تحریک کا فدائی اور ادنیٰ درجہ کا خادم کہہ کر پکارتا ہے۔لیکن جہاں ایسا ہوا کہ اس کے پندار کو ٹھیس لگی، اس کا ایغو انتقام پر اتر آیا اور چونکہ اس سے عزت کا مقام چھن گیا ہوتا ہے اسے انتقام کی لذت اسی صورت میں ملتی ہے کہ وہ دوسروں کو ذلیل کرے۔ اس کے لئے وہ ہر حربہ استعمال کرتا ہے۔لیکن مشکل یہ ہے کہ اس سے اس کے دل کی آگ بجھتی نہیں اور بھڑکتی ہے۔ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ (2:10) وہ اپنے مرض کا علاج یہ سوچتے ہیں کہ دوسروں کو جھٹلایا جائے۔لیکن اس سے اس مرض کو آفاقہ ہونے کے بجائے وہ اور بڑھتا ہے۔ اس کا صحیح علاج کیا ہے، اس کا ذکر آگے چل کر آتا ہے۔

مدینہ کے منافقین

آپ ان احوال و کوائف پر نگاہ ڈالئے جو منافقین کے بارے میں قرآن میں مذکور ہیں تصریحاتِ بالا کی قدم قدم پر شہادت ملے گی۔ حضور ﷺ کی مکی زندگی میں منافقین کا ذکر نہیں ملتا۔ وہ لوگ بالعموم کمینہ فطرت نہیں تھے۔ اس لئے جس کا ساتھ دیتے تھے تو وہ بھی دل کی پوری کشادگی سے اور جس کی مخالفت کرتے تھے تو وہ بھی کھلم کھلا۔لیکن مدنی زندگی میں ایسا نظر آتا ہے جیسے یہ لوگ گروہ در گروہ جماعت مومنین میں شامل ہو گئے۔ یاد رکھئے۔ یہ کوئی الگ گروہ نہیں تھا۔ یہ مسلمانوں کی جماعت

میں شامل تھے۔ خدا اور رسول ﷺ پر ایمان لانے کے مدعی تھے انہی کے معاشرے کے افراد شمار کئے جاتے تھے۔ ان کے اجتماعات میں شریک ہوئے تھے۔ ان کے تمام مشوروں میں ان کے ہمراز بنتے تھے۔ غرضیکہ ایک مخلص مسلمان اور منافق میں (دل کی حالت کے سوا) کوئی اور تمیز نہ تھی۔ قرآن اس پر شاہد ہے۔ چنانچہ جب ان کی منافقت کا پردہ چاک ہوا تو قرآن نے اسے ''کفر بعد از اسلام'' (7:74)۔ یا ایمان کے بعد کفر (63:3) سے تعبیر کیا۔ انہوں نے جماعت میں اس قدر اعتماد پیدا کر لیا تھا کہ نبی اکرم ﷺ انہیں میدان جنگ تک میں ساتھ لے جاتے تھے' حالانکہ ظاہر ہے کہ میدان جنگ بڑا ہی نازک مقام ہوتا ہے۔ اس میں منافقین کی شرکت' جماعت کا تختہ الٹ کر رکھ دیتی ہے۔ جنگ بدر میں تو ان کا ذکر نہیں کیونکہ وہ مشتمل تھی وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ۔ اس کے بعد جنگ احد میں ان کا ذکر ہے۔ جنگ احزاب میں ان کی ریشہ دوانیوں کو طشت از بام کیا گیا ہے اور جنگ تبوک میں تو ان کی فتنہ سامانیاں انتہا تک پہنچ گئی تھیں۔ چنانچہ سورۂ توبہ بیشتر انہی کے واقعات پر مشتمل ہے۔

دو خیال کے مسلمان

ان کے اعتماد کا یہ عالم تھا کہ جب ان کی منافقت کا پردہ چاک ہوا اور ان کے خلاف کارروائی کرنے کی تجاویز سامنے آئیں' تو خود مسلمانوں میں دو پارٹیاں ہو گئیں۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ ان کے خلاف سخت اقدام کرنا چاہئے۔ دوسروں کی رائے تھی کہ نہیں! اتنی بڑی جماعت کو اس طرح کاٹ کر پھینک دینا ٹھیک نہیں۔ ہمیں ان کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہئے۔ سورہ نساء میں انہی دو مختلف الخیال پارٹیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ: فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ (4:88) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ان منافقین کے بارے میں دو پارٹیاں بن گئے ہو۔ جو لوگ انہیں ساتھ رکھنے کا مشورہ دیتے تھے ان سے کہا گیا کہ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ کیا تم ان لوگوں کو راہ راست پر لانے کے ارادے رکھتے ہو جو قوانین خداوندی کو چھوڑ کر غلط راستے پر چل نکلے ہیں؟ تم انہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہو اور وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً اور ان کی انتہائی خواہش یہ ہے کہ جس طرح انہوں نے اس تحریک کا ساتھ چھوڑا ہے تم بھی اسی طرح اس کا ساتھ چھوڑ دو۔ تاکہ وہ اور تم برابر ہو جاؤ۔ (4:90)۔ ان کے علاوہ قرآن نے کچھ ایسے لوگوں کا بھی ذکر کیا ہے جو چاہتے تھے کہ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ (4:91) مسلمانوں کی طرف سے بھی امن میں رہیں اور اپنی پارٹی کی طرف سے بھی۔ یعنی۔۔۔ با مانماز کر وو بہ زاہد شراب خورد۔ کی دوغلی پالیسی پر عمل کرنے والے۔

الزام تراشی

جب اس طرح ان لوگوں کی منافقت کا پردہ چاک ہوتا تو وہ الزام تراشیوں اور بہتان بافیوں کے اوچھے اور کمینے ہتھیاروں پر اتر آتے۔ پہلے وہ ان لوگوں کے خلاف طعن و تشنیع شروع کر دیتے جو جماعت کا ساتھ نہ چھوڑتے۔ ان میں سے جو لوگ تحریک کے کاموں کے لئے کچھ صرف کرنے کے قابل ہوتے یہ ان کی نیتوں پر حملے کرتے۔ اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ

الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ۔ اور جو غریب صرف محنت سے جماعت کے کاموں میں حصہ لیتے' یہ ان کا تمسخر اڑاتے۔ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ (9:79) جو لوگ اس جماعت کی مالی امداد کرتے ان سے جا جا کر کہتے کہ ان کی امداد مت کرو۔ یہ سب دھوکا باز اور فریب کار ہیں۔ هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا (63:7) تم جب اس تحریک کی امداد نہ کرو گے تو یہ لوگ اس رسول ﷺ کا ساتھ چھوڑ کر خود بخود تتر بتر ہو جائیں گے۔

دوسری چالیں:

ان کی اسکیم یہ بھی ہوتی کہ اپنے میں سے کچھ لوگوں کو تیار کرتے کہ وہ اس جماعت میں جا کر شامل ہو جائیں اور پھر ان میں بد دلی پھیلا کر ان سے الگ ہو جائیں تا کہ اس طرح اس جماعت کے کچھ افراد بھی ان کی ساتھ نکل آئیں۔ یہ ان سے کہتے کہ اٰمِنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (3:72) ''تم صبح کے وقت ایمان کا نقاب اوڑھ کر ان کے ساتھ جا ملو اور شام کو ان سے الگ ہو جاؤ۔ اس طرح شاید ان میں سے کچھ لوگ تمہارے ساتھ واپس لوٹ آئیں۔'' پھر' ان کی چال یہ بھی ہوتی کہ اس جماعت کے افراد سے الگ الگ ملتے اور انہیں' جماعت سے بالا بالا انفرادی طور پر راضی کر لینے کی کوشش کرتے تا کہ اس طرح جماعت کمزور ہو جائے۔ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ یہ تمہارے سامنے خدا کی قسمیں کھا کھا کر تمہارے ہمدرد اور بہی خواہ بنتے ہیں تا کہ تمہیں انفرادی طور پر اپنے ساتھ ملانے پر راضی کر لیں۔ ان سے کہا گیا کہ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ (9:62) اگر تم مومن ہو تو تمہارا جواب یہ ہونا چاہئے کہ سوال ہماری انفرادی رضامندی کا نہیں۔ سوال اس نظامِ خداوندی کی رضامندی کا ہے۔ اگر وہ تمہیں معاف کر کے تم سے راضی ہو جائے تو ہم بھی تم سے راضی ہو جائیں گے۔ لیکن اگر تم اسے راضی نہ کرو اور کوشش کرو کہ ہم اُس سے بالا بالا تم سے راضی ہو جائیں تو یہ بات ایمان کے منافی ہے یہ جماعت سے غداری ہے' جس کی کم از کم ہم سے توقع نہ رکھو۔

حضور ﷺ پر ذاتی حملے

وہ اس سے بھی آگے بڑھتے اور خود اس تحریک کے داعی حضور رسالت مآب ﷺ پر ذاتی حملے شروع کر دیئے۔ کبھی کہتے کہ یہ تو ڈکٹیٹر ہے۔ اپنی سی چلائے جاتا ہے۔ ہماری مانتا ہی نہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ مسلمانوں کو شکست پر شکست ہوتی چلی جا رہی ہے يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ کہتے ہیں کہ ان معاملات میں ہمارا بھی کچھ عمل دخل ہے یا یہ اپنی من مانی ہی کرتا جائے گا۔ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ۔ یہ لوگ اس قسم کی باتیں کچھ اس انداز سے کرتے ہیں گویا ان کے دل میں تحریک کا بڑا درد ہے اور یہ اس سے مجبور ہو کر ایسے شکوے کرتے ہیں لیکن جو زہر ان کے دل میں بھرا ہے اسے ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ کہتے ہیں کہ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا (3:153)۔ اگر اس معاملہ میں یہ ہماری سنتا تو ہم اس طرح جنگ میں کبھی نہ مارے جاتے' لیکن وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (3:153) خدا خوب جانتا ہے کہ

ایسا کہنے سے ان کا درحقیقت منشاء کیا ہے۔ کبھی کہتے کہ هُوَ اُذُنٌ (9:61)۔ یہ بڑا کانوں کا کچا ہے۔ اپنی کوئی رائے ہی نہیں رکھتا۔ جو کچھ کسی نے آ کر کہہ دیا اسے صحیح تسلیم کرلیا اور اس کے مطابق فیصلے دینے شروع کر دیئے۔ وہ یہاں تک بھی کہتے کہ اس پر وحی وغیرہ کچھ نازل نہیں ہوتی۔ نہ ہی اس میں خوداتنی قابلیت ہے کہ اس قسم کی باتیں اپنے ذہن سے کر سکے۔ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ (16:103)۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ سب کسی اور شخص کے ذہن کی پیداوار ہے۔ وہی آ کر اسے سکھا جاتا ہے۔

انتہائی کمینگی

اس قسم کے کمینہ فطرت لوگوں کا آخری حربہ یہ ہوتا ہے کہ اس داعیٔ انقلاب کے خلاف پیسے کے معاملہ میں الزامات لگا دیئے جائیں۔ غور فرمائیے کہ وہ ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ ' جسے زمانۂ قبل از نبوت میں لوگ امین کہہ کر پکارتے تھے۔ جس کے متعلق ہرقل کے دربار میں ابوسفیان جیسا سخت دشمن بھی اس کا اعتراف و اعلان کرتا تھا کہ ہم نے اس میں جھوٹ اور بد دیانتی کی کوئی بات نہیں دیکھی۔ اس ذاتِ گرامی کے متعلق یہ بدنہاد مشہور کرتے تھے کہ آپ (معاذ اللہ) پیسے کے معاملہ میں گڑبڑ کرتے ہیں۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ (9:58)۔ ان میں وہ بھی ہیں جو بیت المال کے روپے کے معاملہ میں بھی تجھ پر الزام لگاتے اور طعنے دیتے ہیں۔ غور کیجئے کہ ان باتوں سے حضور ﷺ کا کلیجہ کس طرح چھلنی نہیں ہوتا ہوگا!

الزام تراشی کے نتائج

قرآن کریم نے الزام تراشی کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لئے کیا ہے کہ کسی شخص کو اس کے مقام سے گرانے' اور اسے اذیت پہنچانے اور ذلیل کرنے کے لئے یہ سب سے زیادہ مؤثر حربہ ہوتا ہے۔ آپ اپنی روزمرہ کی زندگی پر غور کیجئے۔ آپ نہایت شرافت سے پر اطمینان زندگی بسر کر رہے ہیں کہ ایک فتنہ جو آپ کے خلاف ایک الزام لگا دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپ ایک منٹ میں اپنے مقام سے گر کر اس کی سطح پر آجاتے ہیں اور ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد آپ دنیا جہاں کے کام چھوڑ کر' اپنی مدافعت پیش کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ اس میں جج کون ہوتا ہے؟ ہر وہ ایرا غیرا جو آپ سے پوچھے کہ اس الزام کی حقیقت کیا ہے۔ اگر آپ اس کے سامنے اپنی صفائی پیش نہیں کرتے اور معذرت کر دیتے ہیں تو وہ باہر جا کر مشہور کر دیتا ہے کہ یہ جھوٹا ہے۔ اگر سچا ہوتا تو اپنی صفائی پیش نہ کرتا؟ جب آپ صفائی پیش کرتے ہیں تو اکثر و بیشتر نہایت معتبر بن کر کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے نزدیک کچھ قصور اس (الزام لگانے والے) کا ہے کچھ ان کا ہے۔ جو زیادہ تفصیل میں نہیں جاتے وہ اتنا کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ صاحب! کچھ تو بات ہوتی ہی ہے جس کی وجہ سے کسی پر الزام لگتا ہے۔ یوں کس کا سر پھرا ہے کہ دوسروں کو مفت میں بدنام کرے۔ لیکن ہمیں اس جھگڑے سے کیا؟ پھر بھی خواہوں اور ہمدردوں کا گروہ باہر نکلتا ہے کہ ان دونوں میں مصالحت کی کوشش کی جائے۔ مصالحت کی کوشش کی بنیاد اس مفروضہ پر ہوتی ہے کہ غلطی دونوں سے ہوتی ہے۔

اور آپ کو معلوم ہے کہ ایسا سمجھنے اور کہنے کے لئے دلیل کیا ہوتی ہے؟ یہ محاورہ کو صاحب! تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔اس محاورے کو ایسے پیش کر دیا جاتا ہے گویا یہ قرآن کی آیت ہے اور کہنے والا اتنا بھی نہیں سوچتا کہ جس آواز کو اس نے تالی کی آواز سمجھا تھا وہ کہیں طمانچے کی آواز تو نہ تھی جو کسی دراز دست نے کسی بے گناہ کے منہ پر دے مارا تھا! بہرحال یہ مصالحت کرانے والے بلاتحقیق کہہ دیتے ہیں کہ صاحب! غلطی دونوں سے ہوئی ہے۔

اب صلح جوئی اور امن پسندی کا تقاضا ہے کہ کچھ وہ ہٹے کچھ یہ بڑھیں۔اور اگر یہ بڑھنے پر آمادہ نہیں ہوتے تو پھر ان کے اچھے اچھے بہی خواہ بھی ناراض ہو کر کوسنے لگ جاتے ہیں کہ بڑا ضدی واقع ہوا ہے۔آپ نے غور فرمایا کہ الزام تراشی کس قدر مؤثر حربہ اور کیسا اذیت دِہ نشتر ہے۔قرآن کریم نے ان لوگوں کے متعلق کہا ہی یہ ہے کہ وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ (9:61)''ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو نبی کو اذیت پہنچانا چاہتے ہیں۔'' اذیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ روپے کی تقسیم کے متعلق الزام کے سلسلہ میں حضور ﷺ کو اپنی مدافعت پیش کرنی پڑی۔۔۔غور فرمایئے! دنیا کا عظیم ترین انسان (علیہ التحیۃ والسلام) جس کے متعلق خود خدا شہادت دیتا ہے کہ وہ اخلاق کی بلند ترین سطح پر ہے۔وہ مجمع کے سامنے اپنی بریت پیش کر رہا ہے کہ میں نے بد دیانتی اور بے انصافی سے کام نہیں لیا۔ پناہ بخدا! فتنہ پرور عناصر کی اذیت کوشیاں اس حد تک چلی جاتی ہیں!

❁❁❁❁

مسجد ضرار

پھر تماشا یہ کہ یہ لوگ یہ سب کچھ کرتے لیکن اس کے باوجود اپنے آپ کو اس تحریک کا مخلص حامی بھی ظاہر کرتے۔ چنانچہ جب انہوں نے جماعت میں تفرقہ پیدا کرنے کی آخری اسکیم سوچی ہے تو اسکے لئے کوئی مخالف تحریک نہیں شروع کی۔انہوں نے ایک مسجد تعمیر کی۔۔کوئی گرجہ یا بتکدہ نہیں بنایا۔اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ مسلمان کسی دوسری تحریک کے ساتھ وابستہ ہو نہیں سکتے۔یہی وہ مسجد تھی جس کے متعلق قرآن نے کہا کہ وہ مسجد نہیں بلکہ كُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ (9:107)۔ یہ مسجد ایمان کا نہیں کفر کا مرکز ہے۔ یہ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کے لئے کھڑی کی گئی ہے۔ یہ درحقیقت ایک کمین گاہ ہے ان لوگوں کے لئے جو اس سے پہلے اس تحریک سے الگ ہو کر مقابلہ کے لئے کھڑے ہو گئے تھے لیکن انہیں کوئی مرکز نہیں ملتا تھا۔وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ان سے پوچھو گے تو یہ قسمیں اٹھا اٹھا کر کہیں گے کہ ہمارا منشاء تحریک کی بھلائی کے سوا کچھ نہیں وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (9:107) لیکن خدا اس کی شہادت دیتا ہے کہ یہ سخت جھوٹے ہیں۔ چنانچہ اس مسجد کے متعلق حضور ﷺ کو حکم ملا کہ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا (9:108) تم اس میں قدم تک بھی نہ رکھنا۔اس مسجد کی بنیاد ریت کے ایسے ٹیلے پر رکھی گئی ہے جو اسے جہنم کے گڑھے میں لے کر گرے گا اور وہ جہنم کیا ہے؟ یہ کہ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ (9:110) اس مسجد کی تعمیر

ان کے دل میں پھانس بن کر کھٹکتی رہے گی اور اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دے گی۔ چنانچہ اس مسجد کے متعلق تاریخ میں ہے کہ حضور ﷺ نے صحابہؓ کو بھیج کر اسے گرا دیا۔

اتنا عرصہ ساتھ رہے

جب اس قسم کے فتنہ پرور عناصر کے خلاف کوئی قدم اٹھایا جائے تو اکثر لوگ کہتے ہیں کہ یہ لوگ اتنا لمبا عرصہ آپ کے ساتھ رہے۔ اس وقت تو آپ نے ان کے خلاف کچھ نہ کہا۔ اب انہیں منافق اور متنفی بتایا جا رہا ہے۔ آپ کو پہلے کیوں نہ پتہ چلا کہ یہ منافق ہیں۔لیکن آپ ذرا اس حقیقت پر غور کیجئے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کی بصیرت سے بڑھ کر دنیا میں کس کی بصیرت ہو سکتی ہے؟ پھر حضور ﷺ کے ساتھ صحابہ کبارؓ کی بھی پوری جماعت تھی۔لیکن اس کے باوجود ہوا کیا؟ یہ فتنہ پرور لوگ حضور ﷺ کے ہاتھ پر اسلام لاتے اور اس جماعت کے اندر رہتے سہتے تھے۔ ان کے معاشرے کا ایک جزو تھے۔لیکن سوچئے کہ ان لوگوں کو پہچاننے اور جماعت سے نکالنے میں کتنا وقت لگا۔حضور ﷺ کی مدنی زندگی کی کل مدت دس سال کی تھی۔ اور غزوۂ تبوک حضور ﷺ کی حیات طیبہ کی آخری مہم تھی۔ جو 9ھ میں واقع ہوئی تھی۔ یہ منافقین غزوۂ تبوک تک میں شامل تھے۔ اس کے بعد ان کے استیصال کلی کا انتظام کیا گیا۔یعنی حضور ﷺ اور جماعتِ صحابہؓ کو ان منافقین کی آخری پہچان کے لئے نو سال کا عرصہ لگ گیا۔ خدا نے کہہ دیا تھا کہ ہم وحی کے ذریعے ان کی نشاندہی نہیں کرنا چاہتے کہ تم ان کی پیشانیوں سے ان کے دل کی حالت معلوم کرلو۔ یہ چیز تمہیں ان کے اقوال وافعال اور اعمال و کردار ہی سے معلوم کرنی ہوگی۔ سورہ محمدؐ میں ہے وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ؕ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ (47:30) اور اعمال و کردار سے پہچاننے میں اتنا لمبا عرصہ لگ گیا اور اس عرصہ میں یہ لوگ جس قدر خرابی کا موجب بنتے رہے' قرآن کے اوراق اس پر شاید ہیں۔ لہٰذا کسی کا یہ کہنا کہ یہ لوگ اتنا لمبا عرصہ تمہارے ساتھ رہے۔تم نے پہلے کیوں نہ کہا کہ یہ منافق ہیں' حقائق سے بے خبری کی دلیل ہے۔

منافقین کے خلاف جنگ

اس مقام پر پہنچ کر اس گروہ کے متعلق حکم آیا ہے کہ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ (9:73) اے رسول! کفار اور ان منافقین کو ایک ہی صف میں شمار کرو۔۔ ان کے خلاف جنگ کرو۔۔ اور ان سے بڑی سختی کا سلوک کرو۔غور کیجئے! وہی رسول جن کی امتیازی خصوصیت یہ بتائی گئی تھی کہ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (3:159)۔''یہ خدا کی رحمت تھی کہ تو ایسا نرم دل واقع ہوا ہے۔ اگر تو دل کا سخت ہوتا تو یہ لوگ تیرے اردگرد سے بکھر جاتے۔''یعنی جس رسول کے متعلق یہ کہا گیا تھا کہ وہ ''غَلِيْظَ الْقَلْبِ''نہیں اب اسی سے کہا جا رہا ہے کہ ''وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ''اس پر ان لوگوں کو بھی غور کرنا چاہئے جو نہایت ہمدردانہ انداز میں کہا کرتے ہیں کہ انسان کو سخت دل نہیں ہونا چاہئے اور اپنے رفقاء کے ساتھ اس قسم کا سلوک نہیں کرنا چاہئے۔ نہ تو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ

کوئی نرم دل ہوسکتا ہے اور نہ ہی ان ''ساتھیوں'' سے زیادہ لمبے عرصہ کا کوئی ساتھی۔ حقیقت یہ ہے کہ جس انگلی کے زخم کا علاج مرہم سے نہ ہوسکتا ہو اور وہ ناسور بنتا جا رہا ہو جس سے باقی جسم کے زہرآلود ہوجانے کا خطرہ ہؤا سے بالآخر کاٹ کر الگ کرنا پڑتا ہے۔ یہ ڈاکٹر کی سنگدلی نہیں ہوتی۔ علاج کا تقاضا ہوتا ہے۔ اس رسول ﷺ سے یہی نہیں کہا گیا کہ وہ ان سے جنگ کرے۔ یہ بھی کہا گیا کہ ان سے ہر قسم کے معاشرتی تعلقات منقطع کرلے۔

معاشرتی تعلقات کا انقطاع:

معاشرتی تعلقات میں کسی کی موت پر تعزیت اور دعائے خیر آخری چیز ہوتی ہے۔ ان لوگوں کے متعلق حکم دیا گیا کہ وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْھُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِہٖ (9:84) اگر یہ مرجائیں تو ان کے لئے دعائے خیر نہ کرو۔ کبھی نہ کرو۔ نہ ہی ان کی قبر پر کھڑے ہو۔ یوں اس گروہ سے جماعت مومنین پاک اور صاف ہوئی۔ جماعت مومنین سے اس کا وعدہ کیا گیا تھا کہ تم میں سے بالآخر خبیث اور طیب الگ ہوکر رہیں گے۔ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ (3:178) یہ ہو نہیں سکتا کہ خدا جماعت مومنین کو اسی حالت میں چھوڑ دے جس میں یہ اب ہے۔ وہ رفتہ رفتہ ایسا کرے گا کہ خبیث اور طیب چھٹ کر الگ الگ ہوجائیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی وفات کے وقت جماعت مومنین میں کوئی منافق نہیں رہا تھا۔ سب کٹ کر یا چھٹ کر الگ ہو چکے تھے۔

پارٹی کا ساتھ

بہر حال میں کہہ یہ رہا تھا کہ منافقین کو پہچاننے میں اتنا وقت لگتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک بات اور بھی پیش نظر رکھنی چاہئے۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ خود تو بدفطرت نہیں ہوتے لیکن وہ پارٹی بازی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ یعنی وہ دل سے مانتے ہیں کہ ہماری پارٹی غلطی کر رہی ہے لیکن ان میں اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ پارٹی کا ساتھ چھوڑ دیں۔ اس لئے وہ ان تمام فتنہ سامانیوں میں منافقین کا ساتھ دیتے ہیں اور اسی وجہ سے تخریب کے جرم میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے پارٹی بازی کو لعنت قرار دیا ہے۔ وہ تو اس باب میں اس حد تک جاتا ہے کہ اس جماعت میں شامل ہونے والوں سے کہتا ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ اے ایمان والو! اگر تمہارے ماں باپ اور بہن بھائی بھی ایمان کے مقابلہ میں کفر کو زیادہ عزیز رکھیں تو تم انہیں بھی اپنا دوست مت بناؤ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (9:23) جو کوئی تم میں سے انہیں اپنا دوست بنائے گا تو اس کا شمار بھی انہی ظالموں کے زمرے میں ہوگا۔ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (9:24)۔ اے رسول ﷺ! ان سے کہہ دو کہ اگر تمہارے ماں باپ یا اولاد۔ تمہارے بہن بھائی یا بیویاں۔ تمہارے دیگر اہل خاندان۔ تمہارے مال و دولت، جسے تم

اس محنت سے کماتے ہو۔تمہاری تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو۔تمہارے مکانات جنہیں تم نے اپنی پسند سے بنوایا ہے۔غرضیکہ دنیا کا کوئی رشتہ اور کوئی جاذبیت خدا اور رسول ﷺ اور اس کے راستے میں جہاد کے مقابلہ میں تمہیں زیادہ محبوب ہیں' تو تم انتظار کرو یہاں تک کہ تمہارے متعلق خدا کا آخری فیصلہ آجائے۔ یادرکھو! جو لوگ صحیح راستے کو چھوڑ کر کسی اور طرف نکل جاتے ہیں وہ اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے۔

یہ ہے برادرانِ عزیز! ایمان کا تقاضا اور خدا کا فیصلہ۔کس قدر صحیح کہا تھا مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے کہ

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے — یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

❁❁❁❁❁

یہ مقام انسانی کیریکٹر کی بہت بڑی آزمائش کا ہوتا ہے۔ہم اپنی دانست میں یہ سمجھتے ہیں کہ نیک آدمی وہ ہے جو کسی کو برا نہ کہے۔ جو کسی کا دل نہ دکھائے۔ ایسے آدمی کی سب تعریف کرتے ہیں۔لیکن قرآن کی رو سے نیک آدمی کا فریضہ اس سے کہیں آگے ہے۔اور وہ ہے نہی عن المنکر۔غلط بات سے دوسروں کو روکنا اور یہ ظاہر ہے کہ کسی سے یہ کہنا کہ وہ غلط راستے پر چل رہا ہے' اور اسے اس راہ سے روکنے کی کوشش کرنا' اس سے عداوت مول لینا ہے۔اس کے نزدیک بہت برا بننا ہے۔اگر کوئی شخص اس طرح برا بننے کے لئے تیار نہیں ہوتا تو وہ اپنے آپ کو مومن نہیں کہلا سکتا۔خدا کی میزان میں اس کی ایسی نیکیوں کا پرکاہ جتنا بھی وزن نہیں جن سے مقصود یہ ہو کہ اسے سب اچھا جانیں۔ جب مومن کا فریضہ یہ ٹھہرا کہ وہ غلط کار کو غلط کاری سے روکے تو اسے غلط کاروں کی دنیا میں برا بننے کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہئے۔ اسلامی معاشرہ میں (Neutral) یا (Indifferent) کا کوئی مقام نہیں۔ یہاں تو یا خدا کا بندہ بن کر رہنا ہوگا یا طاغوت کا۔جس میں برائی کو روک کر برا بننے کی ہمت نہیں اس کے لئے اس سے بہتر نصیحت کوئی نہیں کہ

جا بیٹھ کسی غار میں ۔۔۔ اللہ کو کر یاد

مرض کا علاج:

میں نے شروع میں کہا تھا کہ قرآن کریم نے منافقت کو ''دل کا مرض'' قرار دیا ہے۔یعنی (Egoism) دوسری طرف اس نے اپنے متعلق کہا ہے کہ وہ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوۡرِ (10:57) یعنی دل کی بیماریوں کا علاج۔سوال یہ ہے کہ قرآن کریم اس مرض کا علاج کیا بتاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر مرض کو اس کے ابتدائی منازل میں پکڑ لیا جائے تو علاج آسان ہوتا ہے۔اسی لئے قرآن نے کہا ہے کہ اگر یہ لوگ اپنی روش سے توبہ کر کے صحیح راستہ اختیار کر لیں تو ان کے لئے بہتر ہے۔فَاِنۡ یَّتُوۡبُوۡا یَكُ خَیۡرًا لَّهُمۡ (9:74) اس سلسلہ مین قرآن انہیں ایک بات سمجھاتا ہے اور وہ بات بڑی اہم ہے' وہ ان سے کہتا ہے کہ تم عزت کے بھوکے ہو۔تم یہ تمام حرکات اس لئے کر رہے ہو کہ تم سے عزت کا مقام چھن گیا ہے۔یہی تمہارا مرض ہے۔اس کا علاج یہ ہے کہ تمہیں پھر سے عزت کا مقام حاصل ہو جائے۔اس کے لئے تم اپنے ذہن سے یہ نسخہ تجویز کرتے ہو کہ اس

جماعت کی تخریب سے تمہیں عزت اور نمود حاصل ہو جائے گی۔ لیکن یہ غلط ہے۔ تم نے درحقیقت اپنے متعلق صحیح اندازہ نہیں لگایا۔ تم نے سمجھا کہ اس تحریک کو تمہاری وجہ سے عزت حاصل ہے اور جب تم اس سے الگ ہو کر اس کی تخریب کرو گے تو اس کی عزت چھن جائے گی اور تمہیں عزت مل جائے گی۔ یہ ہے تمہارا اپنے متعلق وہ غلط اندازہ جس کی وجہ سے تم جہنم کے عذاب میں مبتلا ہو۔ یاد رکھو۔ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (63:8)۔ عزت تو اس تحریک کے ساتھ وابستگی اور اس جماعت کی رفاقت ہی سے حاصل ہو سکے گی۔ جب تک تم اس حقیقت کو نہیں سمجھ لیتے تمہارے دل کا روگ دور ہو نہیں سکتا۔ تمہارا یہی روگ تھا جس کی وجہ سے تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ تم نے اس تحریک کا ساتھ دے کر اس پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا (اے رسول! یہ تم پر احسان دھرتے ہیں کہ اسلام لا کر تمہارے ساتھ شامل ہو گئے)۔ اگر تمہارے دل میں للّٰہیت ہوتی تو تم یہ سمجھتے کہ اس تحریک نے تم پر احسان کیا ہے جو تمہیں زندگی کا صحیح راستہ مل گیا۔ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (49:17)۔ (ان سے کہہ دو کہ تم اپنی اسلام سے مجھ پر احسان مت جتلاؤ۔ تمہارا اسلام پر احسان نہیں۔ بلکہ تم پر خدا کا احسان ہے کہ اس نے ایمان کی شمع نورانی سے تمہاری زندگی کی راہیں روشن کر دیں۔ اگر تمہارے دل میں صداقت ہوتی تو تم احسان جتلانے کے بجائے اپنے آپ کو زیر بار احسان محسوس کرتے اور اس صورت میں تمہارے دل کی کیفیت شکر گذاری کی ہوتی نہ کہ شکوہ طرازی کی۔۔ وہ ان لوگوں کو یہ کچھ سمجھاتا ہے تا کہ وہ اپنا اور اس تحریک کا صحیح مقام سمجھ لیں۔ لیکن جن لوگوں کا مرض، علاج کی حد سے آگے بڑھ چکا ہو وہ ان سے کہتا ہے کہ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ (3:119) یاد رکھو! اگر تم انہی خیالات میں غرق رہے تو تم اپنے غصے کی آگ میں بھسم ہو کر خود ہی مر جاؤ گے۔ کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔ یہ ہے وہ عبرت انگیز انجام جو ایسی ذہنیت رکھنے والے لوگوں کا ہوتا ہے۔ ایسا عبرت انگیز کہ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ (44:29) پھر ان پر نہ آسمان رویا اور نہ زمین کی آنکھ سے کوئی آنسو ٹپکا۔

احتیاطی تدابیر

یہ ہے برادران عزیز! وہ گروہ جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ ان سے محتاط رہنے کی بڑی ضرورت ہے۔ اس کے لئے صحیح تدبیر یہ ہے کہ جو شخص آپ کی تحریک کا رکن بننا چاہے اس کے متعلق حتی الامکان تحقیق کر لی جائے کہ وہ کس ذہنیت کا انسان ہے۔ یہ اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ آپ ہر اس شخص کو جو آپ کے فارم ممبری پر دستخط کر دے، ممبر بنا لیں اور بعد میں اسے رکنیت سے خارج کرنا پڑے۔ خارج ہونے والا کبھی اس بات کا اعتراف نہیں کرے گا کہ اس کا اخراج اس کی کسی غلطی، کمی یا لغزش کی وجہ سے عمل میں آیا ہے (الا ماشاءاللہ) وہ سارا الزام تحریک اور اس کے ارباب بست وکشاد کے سر دھرے گا اور اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کے لئے جگہ جگہ پراپیگنڈہ کرتا پھرے گا۔۔ پھر لوگوں کی ذہنیت بھی عجیب ہے۔ زندگی میں آپ کے بیسیوں دوست بنتے ہیں اور ان میں سے کتنے ایسے ہوتے ہیں جن سے کچھ وقت کے تجربہ کے بعد آپ کے

تعلقات باقی نہیں رہتے۔ انہیں اپنے دوستوں کے حلقہ سے خارج کرنے میں آپ اپنے آپ کو کبھی مورد الزام قرار نہیں دیتے۔ لیکن اگر کوئی تحریک' انہی حالات میں کسی کو اپنی حلقہ سے خارج کر دیتی ہے تو آپ اس شخص کو نہیں' بلکہ تحریک کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ اگر آپ شروع ہی میں اس کا محاسبہ کرلیں اور اسے اپنی جماعت کا رفیق بننے کا اہل نہ سمجھیں تو اس کے لئے آپ کے خلاف کسی پراپیگنڈہ کی گنجائش نہیں ہوگی۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی اصلاح کرکے آپ کے ساتھ شامل ہونے کے قابل بن جائے۔ یاد رکھئے! آپ کی تحریک' سیاسی جماعتوں جیسی نہیں' جن میں ساری نظر ارکان کی تعداد پر ہوتی ہے۔ آپ تعداد کی کثرت پر بالکل نہ جایئے۔ دس مخلص قرآنی دوست' سو مفسدین اور ہزار مذبذبین سے بہتر ہیں۔ اور اخلاص کا معیار ایک ہی ہے۔ یعنی الٰہیت جس کا ذکر میں نے شروع میں کیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں کے سامنے صرف ایک مقصد ہو اور وہ یہ کہ قرآنی فکر سے وابستگی کے بعد میرے اپنے اندر کس قدر تبدیلی پیدا ہوگی اور میری اس رفاقت سے اس آواز کے آگے بڑھنے میں کسی حد تک مدد ملے گی۔ قرآنی تحریک میں تو شامل ہونے کا اہل ہی وہ ہے جس کا یہ ایمان ہو کہ۔

عشق میں ایک تم ہمارے ہو باقی جو کچھ ہے سب تمہارا ہے

❁❁❁❁

غریب لوگ:

قرآنی دعوتِ انقلاب کے سلسلہ میں ایک بات اور بھی سامنے آتی ہے' اور وہ یہ کہ اس دعوت پر سب سے پہلے غریبوں کی جماعت لبیک کہتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم' اس دعوت کی سب سے پہلی آواز کو سامنے لاتے ہی اس حقیقت کو نمایاں طور پر سامنے لایا ہے۔ جب حضرت نوحؑ نے قوم کے دولت مند طبقہ کے سامنے دعوت کو پیش کیا تو انہوں نے اعتراض ہی یہ کیا کہ ہم تمہاری جماعت میں کس طرح شامل ہو جائیں جبکہ حالت یہ ہے کہ وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا اس جماعت میں جو لوگ شامل ہوئے ہیں وہ ہمارے معاشرہ کے نہایت ادنیٰ درجے کے کمین لوگ ہیں۔ بَادِيَ الرَّاْيِ ان کی شکل وصورت سے ظاہر ہے کہ وہ کس حیثیت کے مالک اور کس عقل وفکر کے حامل ہیں۔ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ (11:27)۔ کچھ اونچے طبقہ کے لوگوں کی جماعت ہوتی تو ہم اس میں شامل بھی ہوجاتے۔ آپ ان لوگوں کو جماعت سے نکال دیجئے۔ پھر ہم آپ کے ساتھ شامل ہوجائیں گے۔ ان لوگوں سے آپ کو ملے گا کیا! ان کے اس مطالبہ اور اعتراض کے جواب میں حضرت نوحؑ نے جو کچھ کہا وہ غور سے سننے کے قابل ہے۔ آپ نے فرمایا: وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ مجھے کچھ علم نہیں کہ یہ لوگ کیا کام کرتے ہیں۔ نہ ہی مجھے ایسا کچھ معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔ مجھے تو اتنا ہی معلوم ہے کہ یہ قلب سلیم لے کر حاضر ہوئے ہیں اور میزان خداوندی میں وزن' مال ودولت کا نہیں' قلب ونگاہ کا ہوتا ہے۔ تمہاری نگاہ اپنی دولت اور وجاہت پر ہے اور خدا کی نگاہ ان کے خلوص اور حسنِ نیت پر۔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ (11:31)۔ لہٰذا وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ میں تمہاری خاطر ان مفلسوں اور غریبوں کو دھتکار نہیں سکتا۔ میں اگر تمہارے پاس خاطر سے

انہیں نکال دوں تو اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ (11:29) یہ جب خدا کے حضور اس کی شکایت کریں گے تو میں اس کا کیا جواب دوں گا۔ اس لئے تمہارا مال و دولت تمہیں مبارک۔ میرے لئے یہی مفلس و نادار دنیا کی سب سے بڑی متاع ہیں۔

اور یہی وہ شکایت تھی جو سرداران قریش کو نبی اکرم ﷺ کے خلاف تھی اور جسے (علامہ اقبال مرحوم کے الفاظ میں) ابو جہل نے غلافِ کعبہ کو تھام کر اپنے خداؤں کے حضور باصد آہ وفغاں' ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ۔

مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب — از قریش و منکر از فضلِ عرب

در نگاہِ او یکے بالا و پست — با غلام خویش بر یک خواں نشست

قدرِ احرارِ عرب نشناختہ — با کُلُفتانِ حبش در ساختہ

احمراں با اسوداں آمیختند — آبروئے دودمانے ریختند

عبس وتولیٰ:

یہی وہ بنیادی حقیقت ہے جس کی طرف قرآن کریم نے' آسمانی انقلاب کے ہر داعی کی توجہ سورۂ عبس کے تمثیلی انداز میں منعطف کرائی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ داعی الی القرآن کی کیفیت یہ نہیں ہونی چاہئے کہ عبس وتولیٰ ان جاءہ الاعمیٰ اس کے پاس ایک غریب اندھا آیا تو اس نے تیوری چڑھالی اور منہ پھیر لیا۔ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى۔ اس سے کوئی پوچھے کہ تجھے کیا معلوم کہ قرآن کی تعلیم اس کی کس قدر نشوونما کر دیتی۔ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى۔ یا وہ اسے سن لیتا تو یہ اس کے لئے کچھ نہ کچھ فائدہ کا موجب ہو جاتی۔ لیکن تو ایسے لوگوں کو چھوڑ کر ان لوگوں کو زیادہ مستحق توجہ سمجھتا ہے اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۙ﴿۵﴾ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ؕ﴿۶﴾۔ جو اپنے آپ کو تجھ سے' تیری دعوت سے' اس قرآن کی فکر سے' مستغنی سمجھتے ہیں۔ تو چاہتا ہے کہ ایسے لوگوں کو پکڑ پکڑ کر مومن بنائے حالانکہ تجھ پر اس کا کچھ الزام نہیں آئے گا کہ ایسے لوگ حق وصداقت کی راہ پر کیوں نہیں آئے۔ تو ان لوگوں کے تو پیچھے بھاگتا ہے۔ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۙ﴿۸﴾ وَهُوَ يَخْشٰى ۙ﴿۹﴾ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۚ﴿۱۰﴾ اور جو خود دوڑتا ہوا تیری طرف آتا ہے اور زندگی کی خطرناک گھاٹیوں کا خیال دل میں لئے ہوئے آتا ہے۔ تو اس سے لاپرواہی برتتا ہے۔ حالانکہ یہی وہ لوگ ہیں جو فی الحقیقت تیری توجہ کے مستحق ہیں۔ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ یہ تمثیلی بیان ایک بہت بڑی حقیقت کی یاددھانی کراتا ہے۔ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ (80:1-12)۔ سو جس کا جی چاہے اس فراموش کردہ حقیقت کو اپنے سامنے لے آئے۔ یہ ہے وہ عظیم نکتہ جس کی یاددہانی' قرآن' ان لوگوں کو کراتا ہے جو اس دعوت کو لے کر اٹھیں۔ لہٰذا برادرانِ عزیز! آپ کی حقیقی متاع یہی غریب و نادار سے رفیق ہیں جن میں اکثر کے پاس' اس سردی میں جسم ڈھانپنے کے لئے گرم کپڑے بھی نہیں۔ لیکن جن کے سینے میں ایسا گرم دل ہے جس کی حرارت' موم کے بنے ہوئے بڑے بڑے مہیب ''خداؤں'' کو پگھلا کر رکھ دیتی ہے اور وہ بھی ہیں جن کے پاس آپ کی اس محفل تک پہنچنے کے لئے ریل کا کرایہ تک بھی نہیں ہوتا لیکن وہ یہ کہتے ہوئے' مستانہ وار

یہاں پہنچ جاتے ہیں کہ

بے دست و پا نیم کہ ہنوز از دفور عشق

سود است در سرم کہ بہ سامان برابر است

لہٰذا میرے عزیز بھائیو! لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ (15:88) تم ان مفاد پرستوں کے مال و دولت کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو اور اپنی توجہ اپنے ان نادار لیکن مخلص رفیقوں پر مرکوز کرو جو آپ کی حقیقی متاع ہیں۔

بہ چشم کم منگر عاشقانِ صادق را

کہ ایں شکستہ بہایان، متاعِ قافلہ اند

اپنے اندر تبدیلی

میرا مطلب یہ نہیں کہ آپ کی تحریک کو آگے بڑھنے کے روپے پیسے کی ضرورت نہیں۔ نہ ہی میرا مطلب یہ ہے کہ مال و دولت والوں میں مخلص اور وفا شعار ہوتے ہی نہیں۔ انہی میں عثمانؓ غنی جیسے بھی تو ہوتے ہیں۔۔۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ دل کی صداقت اور خلوص کی بنا پر نہیں بلکہ محض مالی امداد کے سہارے تحریک میں نمایاں مقام حاصل کرنے کے لئے شامل ہوں، وہ تحریک کے لئے ہمیشہ نقصان کا موجب ہوں گے آپ کی تحریک میں معیار فضیلت، تقویٰ ہونا چاہئے۔۔۔ یعنی خلوصِ قلب کے ساتھ فرائض منصبی کی ادائیگی۔۔۔ نہ کہ مال و دولت اور جاہ حشمت۔ آپ یہ نہ دیکھئے کہ کسی کے پاس کیا ہے۔ یہ دیکھئے کہ وہ خود کیا ہے۔ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (46:19) آپ کا بنیادی معیار ہونا چاہئے۔ آپ کی تو تحریک کا مقصد ہی یہ ہے کہ قرآنی تعلیم کی رو سے آپ کے اپنے اندر تبدیلی کس قدر پیدا ہوئی ہے۔ اس لئے آپ کے ہاں عزت اور فضیلت ماپنے کا معیار ہی ''تبدیلی'' ہونا چاہئے نہ کہ خارجی مقبوضات۔ میں نے اس مرتبہ کھلے اجلاس میں اپنے ایک خطاب کا موضوع یہ رکھا ہے کہ ''مومن کسے کہتے ہیں'' آپ اسے بغور دیکھئے اور پھر اس کی روشنی مین اپنا محاسبہ کرتے رہئے کہ آپ کے اندر کس قدر تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔ اگر آپ کے اندر قرآنی زاویہ نگاہ سے تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تو پھر، میرے عزیز دوستو! نہ آپ کو قرآنی فکر کا سمجھنا کچھ فائدہ دے سکتا ہے اور نہ اس تحریک کے ساتھ وابستگی کچھ مفید ہوسکتی ہے۔۔ اور جب میں ''آپ'' کہتا ہوں تو اس کے اندر اپنے آپ کو سب سے پہلے شامل کرتا ہوں۔ اس داخلی تبدیلی کے بغیر یہ آپ کے اجتماعات و تقاریب۔ آپ کے درس اور تقاریر، کھیل تماشہ سے زیادہ کچھ نہیں۔ قرآن کے الفاظ ہیں۔ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ (9:65) جن لوگوں کے متعلق آپ کو شکایت ہوتی ہے کہ وہ تحریک کے اندر ہوتے ہوئے بھی تحریک کا ساتھ نہیں دیتے بلکہ الٹا تخریب کا موجب بنتے رہتے ہیں، یہ وہی ہیں جو اس تمام جد و جہد کو محض کھیل تماشہ سمجھتے ہیں۔ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (49:14)۔ قرآن ان کے حلق سے نیچے اترا ہی نہیں ہوتا۔ اگر قرآن دل کی گہرائیوں میں اتر جائے

تو یہ ناممکن ہے کہ اس شخص کے دماغ میں کوئی خیال بھی ایسا آنے پائے جو قرآنی تحریک کے لئے نقصان کا موجب ہو۔ اس لئے برادرانِ گرامی قدر! آپ تھوڑی دیر کے لئے رُک کئے اور اپنے اپنے دل کو ٹٹو لئے کہ قرآن آپ کے دل میں اتر چکا ہے یا نہیں۔ قرآن دل میں اتر جائے تو پھر یہ ساری کائنات بدل جاتی ہے۔ پھر تو کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدہ سے تو دنیا بدل گئی

قرآنی دعوت کی اہمیت:

رفیقانِ محترم! یوں تو اس تیرہ سو سال کے عرصہ میں کونسا زمانہ ایسا تھا جس میں قرآنی دعوت کو عام کرنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ ضرورت جس قدر شدید ہمارے دور میں آ کر ہوتی ہے؛ ایسی شدت اس نے اس سے پہلے شاید ہی کبھی اختیار کی ہو۔ آج ایک طرف تو یہ کیفیت ہے کہ ساری دنیا سمٹ کر گویا ایک بستی بن گئی ہے اور دوسری طرف زمانہ وہ آ گیا ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا تھا کہ كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا (76:7) جس میں فساد کی چنگاریاں چاروں طرف پھیل رہی اور اڑ اڑ کر دوسروں کو لگ رہی ہوں گی۔ اس حشر آسا افراتفری اور قیامت نما نفسانفسی میں ظاہر ہے کہ زندگی کے بلند مقاصد کی طرف توجہ دینے کی فرصت کسے ہوگی۔ ایسے عالم میں جبکہ

کسی کو رنگ سے مطلب کسی کو خوشبو سے
گلوں کے چاکِ گریباں کی بات کون کرے

لیکن عزیزانِ من! یہی تو وہ وقت ہے جب قرآن کی آواز بلند کرنے والوں کی ہمتوں کی آزمائش ہوتی ہے۔ اس وقت ساری دنیا میں قرآن خالص کی آواز صرف آپ کی اس ننھی سی جماعت کی طرف سے بلند ہو رہی ہے۔ اس لئے آپ کی ذمہ داریاں بڑی عظیم اور آپ کی کوششوں کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے۔ دنیا اپنے مختلف تجارب کو آزما چکی ہے۔ اسے نجات و سعادت کی راہ کہیں نظر نہیں آئی۔ انسانوں کے خود ساختہ نظریاتِ زندگی اور نظامہائے حیات میں یہ راہ نظر آ ہی نہیں سکتی۔ یہ صرف قرآن کی شمعِ نورانی ہے جو شب تیرہ و تار میں، راہ گم کردہ مسافروں کو سراغِ منزل دے سکتی ہے۔ سوچئے کہ اگر قرآن کی موجودگی میں انسانیت اس طرح سرگرداں و حیراں پھرے تو اسکی ذمہ داری کس کے سر عائد ہوگی؟ وقت ہے کہ آپ اُٹھئے اور قرآن کے بابِ عالی پر دستک دے کر پکاریئے کہ

گھٹا اٹھی ہے تو بھی کھول زلفِ عنبریں ساقی
تیرے ہوتے فلک سے کیوں ہو شرمندہ زمیں ساقی

آپ دستک دیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ نورانیت کا پیکر ساقیِ ازل کس طرح کوثر بدوش و جنت بداماں وجۂ شادابیٔ عالم بنتا ہے۔ آپ نے ایک ''تجارت'' تو ابوالہوسوں کی دیکھی ہے جس کا ذکر شروع میں کیا جا چکا ہے اور جس کے متعلق، قرآن نے کہا

ہے کہ ان کی تجارت انہیں کوئی فائدہ نہ دے سکی اور ایک تجارت وہ ہے جس کے متعلق آپ کا خدا یہ کہتا ہے کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ اے ایمان والو! کیا میں تمہیں ایک ایسی تجارت کی نشاندہی کروں جو تمہیں درد انگیز عذاب سے بچا لے! تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (61:10-11) تم خدا اور اس کے رسول پر اس طرح ایمان لاؤ کہ وہ تمہارے دل کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ اور پھر خدا کے راستے میں اپنی جان و مال سے مسلسل جدوجہد کرتے رہو۔ اگر تم حقیقت کا علم رکھتے ہو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ سودا تمہارے لئے بہت نفع بخش ثابت ہوگا۔ یہی وہ تجارت ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ لَّنْ تَبُوْرَ (35:29) اس میں کبھی نقصان نہیں ہوگا یہ سودا گھاٹے کا ہے ہی نہیں۔ اس سے تم کبھی تباہ نہیں ہو گے۔ لہٰذا برادرانِ عزیز! آپ کو اس تجارت میں اپنا ''سرمایہ'' لگانا چاہئے۔ اس کا منافع روپے پیسے یا جھوٹی عزت اور تسکینِ پندار کی شکل میں نہیں ملتا۔ یہ ملتا ہے انسانی ذات کی نشوونما کی شکل میں۔ اور جسے یہ منافع مل جائے اس کی تجارت کے نفع بخش ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے! دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ احباب کی ہمتوں میں برکت۔ ارادوں میں استقامت۔ عزائم میں رسوخ اور قدموں میں ثبات عطا فرمائے۔ اور آپ کو وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ﴿۴﴾ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ﴿۵﴾ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ﴿۴﴾ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ﴿۵﴾ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ﴿۶﴾ سے ہر مقام پر محفوظ رکھے۔

جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے، یوں تو میری زندگی کی ہر سانس پہلے بھی اس مقصد لئے وقف تھی لیکن جب سے مجھے (سابقہ اپریشن کے بعد) گویا زندگی کی توسیع (Extension) ملی ہے، یہ احساس اور بھی شدید ہو گیا ہے کہ مشیت نے ہنوز مجھ سے کچھ اور کام لینا ہے۔ لیکن یہ کام، میرے عزیز ہم سفرو! آپ کی رفاقت کے بغیر تکمیل تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ اس لئے آپ اپنی رفتار کو اور ذرا تیز کر دیجئے۔ تیز ترک گام زن، منزل ما دور نیست۔ میری دعا تو قرآن کی بارگاہ میں ایک ہی ہے کہ

روزم تو برر فروز و شبم را تو نور دِہ
ایں کارِ تست۔ کارِ مہ و آفتاب نیست

آخر میں برادرانِ عزیز! میں بخلوص قلب آپ کا سپاس گزار ہوں کہ آپ نے اس سردی کے موسم میں اتنے دور دراز مقامات سے زحمتِ سفر گوارا فرما کر اپنی اس ملی اجتماع میں شرکت فرمائی۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے اس جذب و کیف کو دیکھ کر خود میری زندگی بڑھ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ احباب کو خوش و خرم رکھے اور زندگی کے ہر بلند مقصد میں جو قرآن کے مطابق ہو، شاد کام و کامران فرمائے۔

والسلام علیکم۔ برادرانِ عزیز

خالد بشیر فاروقی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

محسنِ انسانیت ڈاکٹر سردار احمد قریشی (1998ء-1921ء)

(پی ایچ ڈی، پلانٹ بریڈنگ اینڈ جنٹیکس)

تمغۂ قائداعظم، ڈگری: ڈاکٹر آف سائنس

خالقِ کائنات اللہ جل شانہٗ کی صفات میں سے ایک صفت ہے ''الرزاق'' لفظ رزاق کا مادہ ہے ''رزق'' عربی مبین میں اس کے معنی ہیں جو غذا خدا کی طرف سے ذی حیات کو بطورِ سامانِ نشوونما ملے، بارش کو بھی رزق کہتے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے رزق سے مراد کسی چیز کو وقت مقررہ پہ دینا۔ قرآنِ مجید نے تمام کھانے پینے کی چیزوں کو رزق اللہ کہا ہے (دیکھئے سورۃ البقرہ، آیت:60)

اس پیرائے میں علامہ محمد اقبالؒ فرماتے ہیں۔

شاخ نہال سدرہ ای خار و خس چمن مشو
منکرِ او اگر شدی منکرِ خویشتن مشو

مطلب' اے اللہ کے بندے! تو اس (سدرہ) شجرہ طوبیٰ (یعنی عالمی اسلامی برادری) کی ایک شاخ ہے جبکہ تو نے اپنے آپ کو زمانے کا جھاڑ جھنکار' تنکا اور خشک گھاس (پسماندہ قوم کا فرد) بنا رکھا ہے۔ اگر تو اللہ کا منکر بنتا ہے تو بنتا پھر مگر اپنی ذات کا منکر تو نہ بن، اپنا مقام پہچان۔

جب میں نے اتنا مطالعہ کر لیا تو خیال آیا اس قدر پھیلی ہوئی خوبصورت کائنات میں اللہ کی سب سے اعلیٰ مخلوق بنی نوعِ انسان اس کائنات کو کیسے آگے بڑھاتا ہے اور سمجھ میں آیا کہ انسان کی پیدائش کا مقصد نہ صرف تخلیق اور ایجادات ہے بلکہ اللہ کی صفات کو اپنانا (صبغۃ اللہ) ہے۔ مثلاً بشریت کے دائرے میں رہتے ہوئے ''رزاق'' بننا ہے تخلیق بہت سے نئے اضافے چاہتی ہے۔ چنانچہ اللہ کے متعلق ہے یَزِیۡدُ فِی الۡخَلۡقِ مَا یَشَآءُ (35:1) ''وہ اپنی مشیّت کے مطابق خلق میں اضافہ کرتا رہتا ہے''۔ اس لئے اس کے بندوں کی بھی یہ شان ہونی چاہئے کہ وہ اپنے تخلیقی کاموں میں نئے اضافے کرتے رہیں' اس کو ایجاد کہتے ہیں جس سے آنے والی نسلیں مستفید ہوتی ہیں۔ تو فوراً مجھے اپنے سامنے اپنے محبوب تایا جی ڈاکٹر سردار احمد قریشی کی شخصیت نظر آ گئی۔ جنہوں نے گندم کی پیداوار بڑھانے کے لئے اپنا تن من دھن ایک کر دیا۔

سردار احمد قریشی 4 اپریل 1921ء کو نواں شہر (جالندھر) کی مردم خیز سرزمین میں پیدا ہوئے۔ 1938ء میں فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا۔ چار سال میں بی ایس سی ایگر کلچر فیصل آباد سے کی۔ پھر فوج میں بھرتی ہو گئے اور پل گاؤں جنوبی ہند میں (مہاراشٹر) 3 سال ملازمت کی۔ وہ 1947ء میں انڈین آرمی آرڈننس کور (IAOC) فیروز پور چھاؤنی میں تھے۔

وہیں سے زرعی انسٹیٹیوٹ (لائل پور) جوائن کر لیا۔ دس سال (1957-1947ء) تک ملازمت کے بعد امریکہ چلے گئے جہاں واشنگٹن سٹیٹ یونیورسٹی (Pullman) سے 1959ء میں پلانٹ بریڈنگ اینڈ جنٹیکس میں پی ایچ ڈی کی۔ ڈگری لے کر واپس آ کر ایوب زرعی تحقیقاتی ادارہ، فیصل آباد میں اپنے پہلے عہدے سیریئل باٹنسٹ یعنی ماہر نباتات گندم وغیرہ گریڈ 18 پر فائز ہو گئے۔ ڈاکٹر قریشی کو کئی اعزازات سے نوازا گیا۔ انہیں اپنی ریسرچ کے دوران 1968ء میں تمغۂ قائد اعظم اور 1979ء میں پرائیڈ آف پرفارمنس سے بھی نوازا گیا۔ نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر نارمن ای بورلاگ نے اپنی کتاب "Wheat Research and Development in Pakistan" میں لکھا ہے کہ ڈاکٹر قریشی گندم کی اعلیٰ سے اعلیٰ اقسام نکالنے والوں میں کمانڈ کیا کرتے تھے۔ میرا یہ نوبل انعام بھی انہی کی محنت کا صلہ ہے۔

"Dr. Qureshi Served as a national coordinator of Wheat improvement Project during the period of 1964 - 1970 he launched a dynamic research program to evolve high yielding disease resistant and specific purpose varieties at a faster speed. More than a dozen varieties of wheat were established some of which become very popular both in Pakistan and Middle East. Few Famous varieties ware MaxiPak, Chenab -70, Barani-70, Sandal, Pari, Layallpur-73, Indus-79, Chenab-73, Blue Silver, Punjab-76, Bahawalpur-79, Punjab-81 and Punjab-96 While two wheat varieties were named in his houner i.e SA-42 and SA-75

USAID in one of the article puplished in 1972 admired his services and said "Dr. S.A Qureshi, WHO WAS ONE OF THE EARLIER PARTICIPANTS IS NOW ONE OF THE FORMOST WHEAT BREEDERS ANYWHERE IN THE WORLD."

یہ وہ وقت تھا جب میں نے اُن کی ظاہری اور باطنی زندگی کا مشاہدہ کیا۔ ان کا ظاہر بہت سادہ تھا۔ سائیکل پر دفتر جاتے۔ سادہ سی پینٹ اور شرٹ زیب تن کرتے۔ خود اپنے بوٹ پالش کرنے اور یہ لباس سال میں کبھی کبھار پہنتے۔ کھیتوں میں فصل دیکھنے کے لیے مضبوط جاگر اور جیب والی کاٹن کی پینٹ پہنی ہوتی، اس لئے کہ ان میں مارکر، ٹیگز اور گندم کے بیج یا سٹے رکھنے ہوتے تھے۔ سر پر ہیٹ اور لیموں پانی کی بوتل ساتھ رکھتے۔ دو گھنٹے دفتر، پھر چار بجے تک گندم کے کھیتوں میں نئی ورائٹی کی تحقیق میں مصروف رہتے۔ سردی گرمی ہو، حبس ہو کسی بھی موسم میں انہیں کام پورا کر کے ہی آنا ہوتا۔ ایک روز میں دو پہر کوئی 3 بجے ان کے دفتر گیا کہ اپنی سند کی کاپی اٹیسٹ کروالوں۔ ان کے اسسٹنٹ نے کہا کہ کاپی پر مہر میں لگا دیتا ہوں ڈاکٹر صاحب سے دستخط کروالو۔ پوچھا اس وقت کہاں ہوں گے؟ اُس نے کہا ''کھیتوں کے درمیان پگڈنڈی پر سائیکل چلاتے جاؤ۔ کہیں بھی فصلوں کے درمیان ایک ہیٹ چلتا نظر آئے گا۔ وہی ڈاکٹر صاحب ہوں گے۔ دستخط کرواکر میں ان کے گھر کی طرف چلا۔ جب دائیں بائیں کوٹھیوں کے درمیان سے گزرا تو دیکھا ہر گھر میں ونڈو ائیر کنڈیشنز چل رہے تھے مگر یہ شخص حبس کی پروا کئے بغیر کام میں مگن تھا۔

دوسرا واقعہ بھی پڑھ لیجئے۔ میں اور میرے ساہیوال سے آئے ہوئے چچا ڈاکٹر صاحب کے گیسٹ روم میں سوئے ہوئے تھے۔ رات کے ڈھائی بجے زبردست بارش اور بجلی کی کڑک سے دونوں بیدار ہو گئے۔ اُسی لمحے لائیٹ چلی گئی۔ آسمانی بجلی کی روشنی میں اور دروازہ کھلنے کی آواز سے اندازہ ہوا کہ کوئی کالے لبادے میں اور لانگ شوز پہنے دروازہ کھول رہا ہے۔ پاس جا کر دیکھا تو وہ ڈاکٹر صاحب تھے۔ پوچھنے پر کہتے ہیں ''یار میں اپنی فصل دیکھنے جا رہا ہوں۔ نئی ورائٹی ہے، کہیں وہ گر نہ جائے۔ بڑی ہی منتوں کے بعد مانے ہم نے سمجھایا کہ ہم سب مل کے بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ وضو کریں اور اللہ کے حضور دعا کریں۔

خلقے پسِ دیوانہ و دیوانہ بکارے

مخلوق دیوانے کے پیچھے ہے۔ کوئی بول رہا ہے، کوئی چھیڑ رہا ہے مگر دیوانہ اپنے کام میں لگا ہوا ہے۔

ایک دفعہ یوں ہوا کہ ان کے دوسرے برخوردار مجاہد حسین کی شادی ہوئی تو انہوں نے اپنی دلہن کے اصرار پر اپنی والدہ محترمہ سے کہا کہ ابا جی سے کہیں گھر میں گرم پانی کے لئے گیزر لگوا دیں بات آگے بڑھی تو ڈاکٹر صاحب کی گفتگو کچھ اس طرح تھی:

سوئی گیس ایک قیمتی انرجی ہے، اس سے انڈسٹری چلانی چاہئے نہ کہ گیزر جیسی فضول بات۔ میں تو چوتھائی بالٹی پانی گرم کر کے نہا لیتا ہوں۔ تم بھی ایسے کرلو'۔ چنانچہ آخری دم تک گیزر نہ لگوایا۔

ایک دفعہ گورنر ہاؤس رات کے کھانے پر مدعو تھے۔ گورنر پنجاب نے گندم کی ایک نئی قسم پر بات کرنی تھی۔ ڈاکٹر صاحب فیصل آباد سے ساہیوال، پاکپتن اور اوکاڑہ میں کھیتوں میں مختلف اقسام کی گندم کے نئے پودے دیکھ کر شام کے وقت لاہور ہمارے گھر پہنچے۔ میں نے دیکھا لانگ شوز پر مٹی لگی ہوئی تھی شرٹ اور پتلون بھی ویسی ہی تھی۔ گھڑی پر نظر پڑی سات بج چکے تھے۔ پریشان ہو گئے کہ نہانے اور کپڑے بدلنے لگا تو دیر ہو جائے گی، فوراً ہی منہ دھو کر گورنر ہاؤس روانہ ہو گئے گیٹ

والوں نے اندر نہ جانے دیا کہ ایسے لباس میں کبھی کوئی نہ آیا تھا۔کوئی آدھ گھنٹہ بعد اندر بات کی گئی کہ گیٹ پر کوئی ڈاکٹر قریشی کہہ

رہا ہے کہ اسے اندر مدعو کیا گیا ہے۔تب سیکرٹری دوڑ کر آیا اور اُنہیں اندر لے کر گیا۔ وہاں گورنر اور باقی افسران نے ان کے لباس کی ہیئت کذائی کے باوجود اُٹھ کر استقبال کیا۔۔۔۔ پاکستان کا کونسا شہر ہوگا جہاں اُنہوں نے گندم کی نئی ورائٹی حاصل کرنے کے لئے ٹرائیل نہیں کیا۔گندم کی نئی قسم اور زیادہ پیداوار حاصل کرنے کے لئے جگہ جگہ نئی مٹی میں مختلف اقسام کے بیج سے وافر غذائیت والی قسم کی تلاش میں دن رات ایک کر دیتے تھے۔دس روز حیدر آباد، اگلے دس روز پشاور، کچھ دن کے لئے کوئٹہ اور کبھی ناران کاغان۔جبکہ باہر کے ملکوں میں سوائے روس اور چین کے ہر ملک میں گئے اور وہاں گندم کے موضوع پر تحقیق میں اپنا حصہ ڈالا۔

ایک دفعہ صدر ایوب خان نے انہیں گورنر ہاؤس بلوایا اور کہا کہ میں امریکہ سے ایک خطیر رقم گندم حاصل کرنے کے لئے لایا ہوں۔اس کے لئے مجھے وہاں بڑی شرمندگی اُٹھانا پڑی ہے۔یہ رقم میں تمہارے حوالے کرتا ہوں ایسا کام کرو کہ ہمیں آئندہ کسی بھی ملک سے گندم نہ مانگنا پڑے۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب زرعی یونیورسٹی فیصل آباد کے آڈیٹوریم میں گورنر سوار خاں کی جانب سے ڈاکٹر آف سائنس کی ڈگری سے نوازا جا رہا تھا تو ہندوستان سے آئے ہوئے زرعی ماہر نے اپنی تقریر میں فرمایا:

" There are two wheat scientist in india and one (Dr. S.A Qureshi) in Pakistan working on wheat research but he is ten time ahead than us."

محسن فارانی جو میرے تایا جی مرحوم سے شناسائی رکھتے تھے، بیان کرتے ہیں کہ ایک بار میں لاہور سے لیہ جاتے ہوئے راستے میں رک کر زرعی انسٹیٹیوٹ میں چلا گیا۔ڈاکٹر سردار احمد قریشی کے دفتر سے ان کا پوچھا تو اہلکاروں نے بتایا کہ وہ کھیتوں میں اُگی فصل دیکھنے گئے ہوئے ہیں۔میں وہاں اُن کے انتظار میں بیٹھ گیا۔شدید گرمی اور سہ پہر کا وقت تھا۔پندرہ بیس منٹ بعد وہ اس حال میں لوٹ کر آئے کہ لباس پسینے میں تر بتر تھا، سر پر ہیٹ اور پتلون کے پائنچے ٹخنوں سے اوپر اُڑسے ہوئے تھے اور پاؤں میں لانگ بوٹ تھے جو کیچڑ سے لتھڑے ہوئے تھے۔بڑی خوش دلی اور گرم جوشی سے ملے۔انہوں نے مناسب تواضع کی اور آرام کرنے کو کہا۔میں کچھ دیر ان کی صحبت میں رہا، ان کی عالمانہ سائنسی گفتگو سے فیضیاب ہوا اور پھر رخصت طلب کر کے اپنے اگلے سفر پر روانہ ہو گیا۔میں فصلوں کی تحقیق سے اُن کے شغف اور جانکاہی کا تاثر لیے سوچتا گیا کہ ڈاکٹر قریشی جیسے اصحاب ترقی پذیر پاکستان کے لئے سرمایۂ افتخار ہیں۔افسوس کہ محکمہ زراعت کے مفاد پرست افسروں نے بھٹو دور میں جوڑ توڑ کر کے ڈاکٹر سردار احمد قریشی کو عضوِ معطل بنا دیا۔بھلا ہوا کہ گندم کے عالمی ماہر ڈاکٹر نارمن بورلاگ کا جنہوں نے اپنے دورہ پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو سے مل کر ڈاکٹر قریشی کو ان کے اعلیٰ منصب پر بحال کرایا۔

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عورتوں پر تشدّد
ایک آیۂ کریمہ کی مذہبی و دینی تفسیر

ارشادِ حضرتِ باری تعالیٰ عز اسمہ ہے وَالّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ نُشُوۡزَهُنَّ فَعِظُوۡهُنَّ وَاهۡجُرُوۡهُنَّ فِی الۡمَضَاجِعِ وَاضۡرِبُوۡهُنَّ ۚ (4:34) ترجمہ: اور جن کی بدخوئی کا ڈر ہو تم کو، تو اُن کو سمجھاؤ، اور جدا کرو سونے میں اور مارو، اس آیہ کریمہ کا یہ عام طور پر ترجمہ کیا جاتا ہے۔ ہم نے بھی جو ترجمہ تحریر کیا ہے یہ حضرت شیخ الہند کا کردہ ترجمہ ہے جو مستند ترین ترجمہ سمجھا جاتا ہے۔ اس آیت کے حاشیہ میں حضرت العلام مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب نے تحریر فرمایا ہے ''یعنی اگر کوئی عورت خاوند سے بدخوئی کرے تو پہلا درجہ تو یہ ہے کہ مرد اس کو زبانی فرمائش کرے اور سمجھا دے۔ اگر نہ مانے تو دوسرا درجہ یہ ہے کہ جدا سوئے لیکن اسی گھر میں۔ اس پر بھی نہ مانے تو آخری درجہ یہ ہے کہ اس کو مارے۔ پر نہ ایسا کہ جس کا نشان باقی رہے۔ یا ہڈی ٹوٹے ہر تقصیر کا ایک درجہ ہے اس کے موافق تادیب اور تنبیہ کی اجازت ہے جس کے تین درجے ترتیب وار آیت میں مذکور ہیں اور مارنا پیٹنا آخر کا درجہ ہے۔ سرسری قصور پر نہ مارے ہاں قصور زیادہ ہو تو پھر مارنے میں حرج نہیں۔

جس قدر مناسب ہو مارے پیٹے مگر اس کا لحاظ رہے کہ ہڈی نہ ٹوٹے اور نہ ایسا زخم پہنچائے جس کا نشان باقی رہ جائے۔'' حضرت نے جو یہ تحریر فرمایا ہے ''پھر مارنے میں حرج نہیں جس قدر مناسب ہو مارے پیٹے۔'' تو ہمیں حیرت ہے کہ حضرت نے یہ الفاظ کیسے تحریر کر دیئے ہمارے نزدیک تو عورتوں کو مارنا پیٹنا چوڑ ہوں، چماروں کا کام ہے۔ کوئی شریف آدمی تو ہرگز ہرگز اس کا ارتکاب نہیں کرسکتا۔ حضرت مولانا کی ذاتی شرافت میں تو کلام ہی نہیں ہوسکتا۔ تاہم ہمارے علماء کی زیادہ تر اکثریت اس مار پیٹ کو بُرا نہیں سمجھتی۔ بہرحال اگر وہ اس کو بُرا نہیں سمجھتی تو خوب شوق سے ماریں تاہم نہ تو قرآن کو بدنام کریں اور نہ ہی شریف شرفاء کو اس شغل شنیع پر مجبور فرمائیں۔

(2) ہمارے ہاں قرآنِ کریم کا قدیم ترین اور مستند ترین ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب کا ہے انہوں نے بھی اس آیت کا یہ ترجمہ کیا ہے ''اور جن کی بدخوئی کا ڈر ہو تم کو تو اُن کو سمجھاؤ اور جدا کرو سونے میں، اور مارو۔''

(3) ان کے ہی والد محترم شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی جو برصغیر کے سب سے بڑے عالم شمار ہوتے ہیں اور جنہوں نے سب سے پہلے قرآن کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ وہ اس آیت کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں۔

''وآں زناں کہ معلوم کنید سرکشی ایشاں پس پند دہید ایشاں را۔'' اس آیت کے حاشیہ میں شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں ''وبزنید ایشانرا زدنی کہ نخراشد ونہ شکند عضورا۔ زشت نہ کند وگفتہ اند وعظ نزدیکِ خوفِ نشوز است، وہجر بہنگامِ ظہور نشوز، وضرب بوقت تکرار نشوز۔'' واضح رہے کہ یہ دونوں سزائیں، عورتوں کو خواب گاہوں میں چھوڑنا، اور مارنا، کسی بدچلنی یا بداطواری کی وجہ سے نہیں ہے۔ یہ صرف عورت کی بدخوئی کی سزائیں ہیں۔

(3) تفسیر مظہری میں مرقوم ہے ''اور جن عورتوں کی بددماغی کا تم کو اندیشہ ہو، تو ان کو نصیحت کرو، اُن کو اُن کی خوابگاہوں میں اکیلا چھوڑ دو، اور ان کو مارو۔'' اکثر مفسرین نے حکمِ ضرب کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایسا مارو کہ مار کا نشان نہ پڑ جائے۔

(4) تفسیر عروۃ الوثقیٰ میں مرقوم ہے ''جن بیویوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو تو چاہئے کہ اُنہیں سمجھاؤ۔ پھر خوابگاہ میں ان سے الگ رہنے لگو اور اُنہیں مار بھی سکتے ہو۔ اس تفسیر میں وَاضْرِبُوْهُنَّ کا ترجمہ ''اُنہیں مار بھی سکتے ہو'' کیا ہے یہ ترجمہ غلط ہے اور مترجم کی Guilty Consciousness کی ترجمانی کر رہا ہے۔ مترجم کو خود محسوس ہو رہا ہے کہ مارنے کے فعل کا ارتکاب ایک بُری چیز ہے اس لئے اس کا ترجمہ ''مار بھی سکتے ہو'' کیا ہے۔ حالانکہ یہاں سارے صیغے فعل امر کے ہیں اس لئے یہاں ضرب کا حکم ہے۔ کرنے یا نہ کرنے کی کوئی Choice نہیں ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے لیکن جن عورتوں کو اس سے بھی فائدہ نہ ہو ممکن ہے کہ ان کی فطرت ہی کچھ ایسی سخت ہو کہ سختی وگرمی کے سوا اس کی اصلاح نہ ہو سکتی ہو۔ کیونکہ یہ مثل بھی مشہور ہے کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ اچھا تو اس کے لئے یہ نسخہ بھی آزما کر دیکھ لو اگر کر سکتے ہو تو ایک دو تھپڑ لگا کر دیکھو لو۔ یہ تیسری سزا بہت پابندیوں کے ساتھ دینے کی اجازت دی گئی ہے۔ آپ غور فرمائیں کہ یہ قرآن کی تفسیر ہو رہی ہے اور بیوی کے مارنے کو اس طرح Lightly اور casually لیا جا رہا ہے۔

(5) ایران میں اس موجودہ دور میں جو تفاسیر تحریر کی گئی ہیں ان میں ''المیزان'' کا مقام بہت بلند ہے۔ یہ تفسیر آیت اللہ علامہ محمد حسین طباطبائی کی تحریر کردہ ہے۔ یہ فاطمہ ٹرسٹ لندن، کی پیشکش ہے۔ اس تفسیر میں اس آیت کے ذیل میں تحریر ہے ''اور وہ عورتیں کہ تمہیں جن کی طرف سے سرکشی کا اندیشہ ہو تو اُنہیں نصیحت کرو اور اُنہیں ان کے بستروں پر بے رغبتی کا مظاہرہ کرو اور اُنہیں مارو۔'' یہ مفہوم موجودہ مہذب دور کی تفسیر میں تحریر کیا گیا ہے۔

(6) تفسیر نمونہ بھی ایران میں تحریر کی گئی ہے۔ یہ اس دور کی مقبول ترین تفسیر ہے۔ یہ انقلاب ایران کے بعد تحریر کی گئی ہے اور غالباً وہاں کی حکومت کی سرپرستی میں تحریر کی گئی ہے۔ اس تفسیر کے تحریر کرنے میں دس ''حجۃ الاسلام والمسلمین'' نے حصہ لیا ہے جن کے اسمائے گرامی اس تفسیر کے شروع میں مندرج کئے گئے ہیں۔ اس آیت کے ذیل میں اس تفسیر میں تحریر ہے ''اور اُنہیں ذمہ داریوں کی ادائیگی پر آمادہ کرنے کے لئے عملی شدت کے سوا کوئی بات نہ رہے تو یہاں اجازت دی گئی ہے کہ بدنی سرزنش کے ذریعے اُنہیں ان کے فرائض انجام دینے پر آمادہ کیا جائے۔ اس تفسیر نے مارنے کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ بلکہ اس کی جگہ بدنی سرزنش تحریر کر دیا۔ لیکن بات تو ایک ہی ہے۔

(7) اس دور کے روشن خیال مفسر مولانا مودودی نے اپنی تفسیر ''تفہیم القرآن'' میں تحریر فرمایا ہے ''نبی ﷺ نے بیویوں کے مارنے کی جب کبھی اجازت دی ہے با دلِ ناخواستہ دی ہے اور پھر بھی اسے ناپسند ہی فرمایا ہے۔ تاہم بعض عورتیں ایسی ہوتی ہیں جو پیٹے بغیر درست ہی نہیں ہوتیں، ایسی حالت میں نبی ﷺ نے ہدایت فرمائی ہے کہ منہ پر نہ مارا جائے۔ بے رحمی سے نہ مارا جائے اور ایسی چیز سے نہ مارا جائے جو جسم پر نشان چھوڑ جائے۔''

ہماری طرف سے یہ بات واضح رہے کہ یہ سب تاویلات ہیں۔ غصہ میں کوئی شخص جب مارتا ہے تو ان قیود کا خیال نہیں رکھ سکتا اور نہ ہی ایسی چیزیں ڈھونڈتا پھرتا ہے کہ جن کے مارنے سے نشان نہ رہے۔ اصل بات یہی ہے عورتوں کو مارنا سفلہ اور رزیل لوگوں کا کام ہے۔ مولوی حضرات خود یہ محسوس کر رہے ہیں۔ لیکن چونکہ سابقہ مولوی اس آیت کا غلط ترجمہ اور غلط مفہوم لے چکے ہیں وہ اس مفہوم سے اِدھر اُدھر ہونا نہیں چاہتے۔

(8) حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب پاکستان کے مفتی اعظم تھے۔ اُن کی تفسیر معارف القرآن مشہور تفسیر ہے۔ انہوں نے بھی اس آیت میں واضربوھن کا ترجمہ ''ان کو مارو'' ہی کیا ہے۔ البتہ مارنے کی یہ وضاحت فرمادی ہے کہ ''اس کو معمولی مار مارنے کی بھی اجازت ہے جس سے اس کے بدن پر اثر نہ پڑے اور ہڈی ٹوٹنے یا زخم لگنے تک کی نوبت نہ آئے اور چہرہ پر مارنے کو مطلقاً منع فرما دیا گیا ہے''۔

جناب مفتی صاحب نے عورتوں کو مارنے کی وجہ بھی تحریر فرمادی ہے ''ابن سعد اور بیہقی نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی سے روایت نقل کی ہے کہ پہلے مردوں کو مطلقاً عورتوں کو مارنے سے منع کر دیا گیا تھا۔ مگر پھر عورتیں شیر ہوگئیں تو یہ اجازت مکرر دی گئی۔ مفتی صاحب کا خیال ہے کہ اگر عورتوں کو مارا نہ جائے تو وہ شیر بن جاتی ہیں۔

(9) ہندوستان کے مشہور عالم ومفسر مولانا عبدالماجد دریابادی کی روشن خیالی کا بہت چرچا ہے۔ وہ بی اے پاس ہیں اور فلسفی شمار ہوتے ہیں۔ تاہم انہوں نے بھی اپنی تفسیر میں عورتوں کو مارنے کا حکم جائز قرار دیا ہے۔ البتہ اُنہوں نے عورتوں پر اتنا کرم کیا ہے کہ اس مار کی وضاحت میں تحریر کیا ہے ''اس پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ یہ مار بالکل ہلکی پھلکی قسم کی ہو۔ ایسی نہ ہو جس سے چوٹ زیادہ آجائے یا جس سے رفیق زندگی کی توہین لازم آتی ہو۔ بلکہ مفسر صحابی ابن عباس رضی اللہ عنہ سے تو یہ منقول ہے کہ مار مسواک جیسی ہلکی پھلکی چیز سے ہو۔ مولانا کی تحریر سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ رفیق زندگی کو عزت مند ہونے کی اجازت تو دے رہے ہیں اور اس رفیق زندگی کے مارنے کو توہین سمجھ رہے ہیں مولوی حضرات سے یہ بھی بہت غنیمت ہے۔

(10) مولانا پیر محمد کرم شاہ الازہری کی تفسیر ''ضیاء القرآن'' بریلوی حضرات میں ایک مستند اور مشہور تفسیر ہے۔ اس تفسیر میں دیگر تفاسیر کی طرح عورتوں کو مارنے کا حکم جائز قرار دیا گیا ہے۔ اس تفسیر میں تحریر ہے ''وہ عورت جس میں شرافت کی حس ابھی زندہ ہے وہ اس سرزنش سے ضرور اپنی اصلاح کرے گی لیکن اگر یہ طریقِ کار بھی مفید ثابت نہ ہو تو پھر تم اس کو مار بھی سکتے ہو۔ لیکن مار ایسی سخت نہ ہو جس سے جسم پر چوٹ آجائے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے تو یہ تصریح کردی ہے کہ اگر مارنے کی نوبت آئے تو مسواک یا اسی قسم کی کسی ہلکی چیز سے مارے۔ آج کل کے جہلاء اپنی بیویوں کو بھینسوں کی طرح پیٹتے ہیں اس کی اجازت قطعاً اسلام نے نہیں دی۔'' یہاں ہم مولانا کے بے حد شکر گزار ہیں کہ انہوں نے عورتوں کو بھینسوں کی طرح مارنے کی اجازت نہیں دی۔ یہ ان عورتوں کے لیے بہت بڑا FAVOUR ہے تلک عشرۃ کاملہ، یہاں تک ہم نے دس حوالے تحریر کر دیئے ہیں۔

ہم نے مولویانہ مذہبی تفاسیر کے دس حوالہ جناب کے سامنے پیش کر دیئے ہیں۔ اب ہم آپ کے سامنے اس آیۂ کریمہ کی دینی تفسیر پیش کرتے ہیں۔

عربی زبان میں ضرب کے معنی مارنا آتے ہیں لیکن اس کے معنی صرف مارنے کے ہی نہیں ہیں۔ درسی لغت مصباح اللغات نے اس کے تقریباً دس معنے تحریر کئے ہیں۔ دیگر معانی کے علاوہ ضرب کے معنی ''بیان کرنا'' بھی آتا ہے۔ خود قرآنِ کریم نے ضرب کو بیان کرنے کے معنی میں استعمال کیا ہے ارشادِ عالی ہے كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ (13:17) ترجمہ: اس طرح اللہ حق و باطل کی بات کو سمجھاتا ہے۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا (43:58) ترجمہ: یہ لوگ مجھے بات نہیں سمجھاتے بلکہ محض جھگڑا کرتے ہیں ایک اور مقام پر ارشاد ہے وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا (36:13) ترجمہ: ان کے لئے ایک مثال بیان کرو۔ سورہ حج میں ارشاد ہے: ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ (22:73) ترجمہ: ایک مثال بیان کی جاتی ہے اسے غور سے کان کھول کر سنو۔ ان تمام مقامات پر قرآنِ کریم نے ضرب کو ''بیان کرنے''

کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ آیۂ کریمہ میں وَاضْرِبُوْهُنَّ کے الفاظ ترتیب کے لحاظ سے وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ کے بعد آتے ہیں کہ تم اُنہیں بستروں میں الگ کرنے کے بعد ساتھ میں اُن پر اس اقدام کی وجہ بیان کردو کہ تم نے ان کے ساتھ یہ ناراضگی کا رویہ کیوں اختیار کیا ہے تاکہ تمہارا یہ اقدام اثر انداز ہو مثلاً تم اپنی بیوی کو بتلاؤ کہ فلاں وقت اس نے تم سے بہت بُرا سلوک کیا۔ عربی قواعدہ کی رو سے اس مقام پر وَاضْرِبُوْهُنَّ ترکیب میں فعظوھن کی تاکید اور اس کا بیان ہے۔ یہاں مارنے کا مفہوم کسی طرح بھی درست معلوم نہیں ہوتا لیکن اگر بالفرض کوئی مولوی صاحب اس بات پر اصرار ہی کرتے ہیں کہ وہ یہاں وَاضْرِبُوْهُنَّ کے معنی مارنے کے ہی لیں گے اور ضرور بالضرور اپنی بیوی کو ماریں گے تو ان کی خدمت عالی میں عرض ہے کہ قرآنِ کریم نے جو احکامات دیئے ہیں اور خصوصاً سزاؤں کے احکامات، تو اس مقام پر قرآنِ کریم کے پیشِ نظر اسلامی مملکت ہوتی ہے۔ وہ ان احکامات کے جاری کرنے اور ان پر عمل کرانے کی صورت میں ہمیشہ مملکت کو مخاطب کرتا ہے۔ افراد کو مخاطب نہیں کرتا مثلاً جو چور کی سزا بیان کرتا ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹ دو (5:38) تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کسی شخص کے چوری ہوتی ہے تو وہ محلے کے لوگوں کو اکٹھا کر کے اس چور کے خود ہاتھ کاٹ دے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے ہاں چوری ہوئی ہے وہ اس کی اطلاع تھانے یا عدالت میں دے۔ اس متعلقہ محکمہ میں اس کے جرم کی باقاعدہ تفتیش ہوگی اور اگر وہ شخص مجرم ثابت ہوا، تو عدالت کے لئے قرآن کا حکم ہے کہ چوری کی سزا ''ہاتھ کاٹنا'' ہے۔ حکومت کا ادارہ اس کو یہ سزا دے گا۔ اس زیرِ غور معاملہ میں بھی یہی صورت اختیار کرنی چاہئے کہ پہلے تو بیوی کو سمجھایا جائے۔ پھر اس کو اس کے بستر میں چھوڑ دیا جائے۔ اس کے بعد بھی اگر بیوی نرمی نہ پکڑے اور حالات درست نہ ہوں تو اس کی اطلاع متعلقہ محکمہ کو دی جائے۔ وہ محکمہ اس شکایت کی پوری پوری تفتیش کرے گا اور اگر مرد کی یہ شکایت درست ثابت ہوئی تو وہ محکمہ اس خاتون کو سزا دے گا۔ افراد کو اس بات کی بالکل اجازت نہیں کہ وہ مظلوم عورتوں کو از خود ماریں۔ جیسا کہ مولانا عثمانی نے لکھا ہے کہ جس طرح مردوں کا جی چاہے وہ عورتوں کو ماریں اور پیٹیں۔

یہ بات واضح رہے کہ قرآنِ کریم کے احکامات پر اسلامی ریاست میں ہی عمل ہوسکتا ہے۔ غیر اسلامی نظام میں نہ تو حدود جاری ہوسکتی ہیں اور نہ ہی یہ احکامات جاری ہوسکتے ہیں۔ اس غیر اسلامی نظام میں جبکہ مملکت کے حکام، سیاسی لیڈرز ایم، این، اے وغیرہ لٹیرے ہوں اور عوام کے حقوق اور ان کی روزی غصب کر رہے ہوں، عوام روٹی کو ترس رہے ہوں۔ اس حال میں چور کا ہاتھ کاٹنے کا حکم کیسے جاری ہوسکتا ہے۔ زیرِ نظر معاملہ میں بھی مملکت ہی ایسا شعبہ قائم کرے گی جو عورتوں کی ''سرکشی'' کے کیس کی سماعت کر کے، ان کو مناسب سزا دے گی۔

راجہ عبدالعزیز (دھیر کوٹ، آزاد کشمیر)

متحرک نفسیات

DYNAMIC PSYCHOLOGY

تحلیل نفسی کی برادری میں ایک اہم اور نامور مشہور ماہر نفسیات ایرک فرام (Erich Fromm 1900-1980) کی شخصیت بھی ہے۔ اس کا تعلق جرمنی سے تھا اور تحلیل نفسی کے ذریعے مریضوں کا علاج کرتا تھا۔ فرائڈ کا بنیادی طور پر پیروکار تھا، مگر اکثر مسائل میں اس سے اختلافات بھی رکھتا تھا۔ فرائڈ نے کارل کارکس کے نظریات کی سختی سے تردید کی تھی، لیکن فرام، مارکس کے نظریات کے گہرے مطالعے کے بعد کافی حد تک مارکس کے نظریات سے متاثر ہو گیا تھا۔ فرام نے اپنے وسیع مطالعے، مشاہدے اور تحقیقات کی روشنی میں انسانی شخصیت کی تکمیل کے عمل کو ایک وسیع تر تناظر میں دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ دوسرے محققین نے شخصیت کی تشکیل کے عمل میں معاشرتی عوامل کے کردار کو صرف جزوی طور پر واضح کیا ہے۔ مثلاً اڈلر نے زیادہ تر خاندان کی بات کی ہے اور سلی ون نے شخصی تعلقات (Interpersonal Relations) کو مرکزی حیثیت دی ہے، جبکہ حقیقی معاشرے کے دیگر بہت سے پہلو ہوتے ہیں جو فرد پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کا ایک مخصوص معاشی، سیاسی اور معاشرتی نظام ہوتا ہے۔ انسان اور معاشرے کے مابین ایک دوسرا بڑا اہم پہلو یہ ہے کہ ان کے درمیان دو طرفہ تعلق ہوتا ہے۔ یعنی اگر معاشرہ ایک طرف افراد پر اثر انداز ہوتا ہے تو دوسری طرف معاشرے کی تشکیل بھی انسان ہی کرتے ہیں۔ تغیر پذیر معاشرے میں جب مختلف طبقات پیدا ہو جاتے ہیں تو معاملہ مزید پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ مختلف معاشی حیثیتوں کے افراد میں کشمکش اور اپنے اپنے مفاد کے حصول کے لیے ایک دوڑ شروع ہو جاتی ہے۔ 102/1۔ ذرائع پیداوار کے مالکان کے لیے اپنی بنیادی ضروریات کی تسکین کوئی مسئلہ نہیں ہوتی، بلکہ وہ پُرتعیش زندگی گذارتے ہیں اور محض دولت کے گھمنڈ میں آ کر اپنے آپ کو دوسروں سے برتر و اعلیٰ تصور کرتے ہیں۔ جبکہ معاشی لحاظ سے محروم طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کی پوری زندگی بنیادی ضروریات کی فراہمی اور ان کی تسکین کرنے کے اہتمام میں بیت جاتی ہے اور ہر وقت بے یقینی اور تشویش کا شکار رہتے ہیں، کیونکہ انہیں کبھی بھی اس بات پر یقین نہیں ہوتا کہ ان کی بنیادی ضرورتیں تسلی بخش طور پر پوری ہوتی رہیں گی۔

ایرک فرام نے اس سلسلے میں چند مخصوص قسم کے شخصیاتی رجحانات کا ذکر کیا ہے۔ جس میں ''تجارتی شخصیت''، ''استحصالی

شخصیت'' اور'' ذخیرہ اندوز شخصیت'' شامل ہیں۔عبدالحمید نے استحصالی شخصیت کے بارے میں فرام کے تصورات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔''استحصالی طبقے مختلف حیلے بہانوں سے اپنی دولت میں اضافہ کرتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے عوام کی مشکلات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور ان کے خریدے ہوئے عُلماء، دانشور، وکیل، پروفیسر، ادیب اور شاعر غیر منصفانہ نظام کے حق میں مذہبی، سیاسی، معاشرتی، ادبی اور نام نہاد سائنسی تاویلیں گھڑ کر پیش کر دیتے ہیں اور عام آدمی کو باور کروانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ نظامِ معاشرت عین فطری ہے یہی قدرت کا نظام ہے۔چنانچہ ماضی میں کبھی غلامی کے جواز میں دلائل پیش کئے گئے اور کبھی ذہنی محنت کو جسمانی کام سے برتر قرار دیا گیا، کبھی مذہبی علماء، رومانوی عاشق مزاج ادیب اور نصابی فلسفی عوام کو سمجھاتے ہیں کہ دنیاوی زندگی غیر اہم ہے اور اصل زندگی مابعد الطبعیاتی ہے۔ان حقائق کو ذہن میں رکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس قسم کے معاشرتی اور معاشی حالات میں کس قسم کی شخصیت نشوونما پائے گی۔'' یہ ایک عظیم نفسیات دان کے نظریات تھے، استحصالی نظام کے بارے میں جنہیں ایک دوسرے نفسیات دان نے بیان کیا ہے۔

ایک اور نفسیات دان پروفیسر ساجدہ زیدی نے ایرک فرام کے انہی خیالات کو یوں بیان کیا ہے۔''تجارتی اور استحصالی طبقے کا زاویہ نگاہ ہی استحصالی ہوتا ہے جو دوسروں کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ''استعمال'' کرتا ہے۔یہ لوگ کمزوروں کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ان کی آسودگی کا ذریعہ ہر وہ چیز (منصب یا دولت، شہرت یا ملکیت، جاہ و حشم، یا مادی اشیاء) ہوتی ہے جسے وہ دوسروں سے ''چھین'' کر غصب کر سکیں یا دھوکے فریب کے ذریعے حاصل کر سکیں۔اپنی محنت کی روزی پر وہ مطمئن نہیں رہ سکتے۔یہ ٹائپ ہر اس سماج میں موجود ہوتا ہے جس میں سرمایہ دارانہ نظام ہو یا طبقاتی امتیاز ہو، بھوک، غربت اور محرومی ہو یا سماج کا معاشی نظام استحصالی ہو۔ایرک فرام نے اسے ڈاکوانہ سماج کی خصوصیات بتایا ہے۔یہ ٹائپ تقریباً ہر سماج میں موجود ہوتا ہے۔اس ٹائپ کے افراد بھی ''عزتِ نفس'' خودداری اور احترام ذات کے توانا احساسات سے محروم رہتے ہیں۔اور اکثر لاشعوری طور پر خود سے نفرت کرتے ہیں اور تخفیفِ ذات کے مرتکب ہوتے ہیں۔'' یہاں میں ایک بات کا اضافہ کروں گا کہ اس استحصالی اور سلب ونہب کے نظام کے قیام اور استحکام کا باعث خود استحصال زدہ طبقے کے لٹے اور کچلے ہوئے لوگ ہی ہوتے ہیں، جن کے ذریعے طاقتور استحصالی طبقہ کمزور اور مجبور طبقے کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر رکھتا ہے۔

ایرک فرام نے انسان اور کائنات کے بنیادی رشتے کا سوال اٹھایا ہے۔جو بقول ساجدہ زیدی ''فلسفیوں کے لیے تو نیا نہیں ہے لیکن نفسیات دانوں میں ایرک فرام وہ پہلا شخص ہے جس نے یہ جرأت مندانہ قدم اٹھایا ہے۔اس کے خیال میں وہ بنیادی مسئلہ جو تمام انسانوں کے لیے مشترک ہے، یہ ہے کہ فرد کائنات کے تناظر میں اپنے مقام و منصب کا تعین کیسے کرے اور اپنی زندگی کے لیے معنی تلاش کیسے کریں اس کوشش میں سب سے پہلا ادراک اپنی ذات کا کرنا ہوتا ہے، اور وہ ذات او رکائنات کے رشتے کی مسلسل تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔یہی تلاشِ مسلسل انسان کے لیے فردیت کا عمل بن جاتی ہے۔جس کوشش میں ایک طرف فرد کا اپنی ذات کا ادراک حاصل کرنا ہوتا ہے اور دوسری طرف سماج و معاشرہ کے ساتھ اپنے رشتے کی

حرکت کو محسوس کرنا ہے۔'' فرد کی بنیادی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ فرام کا دوسرا تصور انسانی آزادی کا تصور ہے۔ اس کے نزدیک آزادی نوع انسانی کا بنیادی وصف ہے، لیکن حصولِ آزادی کی جدوجہد فرد کے لیے اکثر اوقات مشکل ترین مرحلہ بن جاتی ہے۔ عبدالمجید کے مطابق ''انسان کا ماضی اس کی بنیادی ضروریات کی تسکین کی خاطر جدوجہد کا ایک مسلسل عمل نظر آتا ہے جس کے نتیجے میں انسان نے ترقی کی اور اس کی ضرورتوں کی تسکین زیادہ یقینی ہوگئی۔ انسان جس قدر زیادہ ترقی کرتا گیا، اسی لحاظ سے زیادہ آزاد ہوتا گیا۔ تاہم اس کے نتیجے میں وہ فطرت اور اپنے عزیز و اقارب سے دور ہوتا گیا۔ اپنے آپ کو تن تنہا اور اکیلا محسوس کرنے لگا، جس سے تشویش اور عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوا۔ فرام کا خیال ہے کہ یہ صورتحال صرف انسان کو درپیش ہے دوسرا کوئی جاندار تنہائی کے اس قسم کے احساس سے دو چار نہیں ہوتا۔ فرام نے اس تصور کی وضاحت بچے کی مثال دے کر کی ہے۔'' تشویش اور اکیلے پن کے احساس سے بے بسی، غیر محفوظ اور کمزوری محسوس کر کے انسان دو میں سے ایک راستہ اپناتا ہے۔ پہلا راستہ تعمیل پسند (conformity) کا ہے۔ یعنی صورتحال سے خائف ہوکر انسان انفرادی آزادی کو ترک کر کے وہی کچھ کرنا شروع کر دیتا ہے جو اس کے گرد و پیش کے لوگ کرتے ہیں۔ اس طرح وہ لوگوں کی خوشنودی حاصل کر کے خود کو محفوظ اور طاقتور سمجھتا ہے۔ یوں وہ تشویش اور اکیلے پن کے احساس سے چھٹکارا تو حاصل کر لیتا ہے، لیکن وہ اپنی آزادی اور انفرادیت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ عبدالحمید کے مطابق ''شخصیت کی نشوونما کا یہ انداز جاگیردارانہ معاشرے میں واضح طور پر نظر آتا ہے جہاں روایات سے ہٹ کر اپنی آزادی سے فیصلے کرنے کے عمل کو 'بغاوت'' نافرمانی یا خاندان کی عزت سے کھیلنے کا نام دیا جاتا ہے۔'' پروفیسر ساجدہ کے مطابق فرام نے اسی رجحان کو ذات سے علیحدگی (Self Alienation) کا پیش خیمہ قرار دیا ہے۔ جب انسان اپنی آزادی کا بارگراں اتار پھینکتا ہے۔ اور اپنے جذبہ و عمل سے کٹ کر اپنی صلاحیتوں اور خلاقانہ قوتوں سے بھی رشتہ منقطع کر لیتا ہے۔

تشویش، بے بسی اور اکیلے پن کے خوف سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے، ایرک فرام کے مطابق، انسان کے سامنے دوسرا راستہ، انفرادی نشوونما کا راستہ ہے۔ یعنی انسان اپنی مرضی سے ایک راستے کا انتخاب کرتا ہے، کامیابی کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ مخالفت کا ہمت و جرأت سے مقابلہ کرتا ہے۔ ناکامی کی صورت میں دل برداشتہ نہیں ہوتا بلکہ نئے عزم اور ولولے سے آگے بڑھتا ہے۔ اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور بامعنی عمل کے ذریعے اپنی انفرادیت کو مضبوط کر کے اپنی شناخت کو فروغ دیتا ہے۔ دوسروں پر انحصار کرنے کی بجائے ان کے ساتھ برابری اور عزت و محبت کا رشتہ استوار کرتا ہے۔ اپنی آزادی کا تحفظ اور اپنی ذمہ داریوں کو قبول کرتا ہے۔ انفرادی نشوونما کا راستہ مشکل ضرور ہے لیکن اس پر چل کر فرد کی انفرادیت اور آزادی مجروح نہیں ہوتی اور شخصیت کی نشوونما صحت مند خطوط پر ہوتی ہے۔ اور اکیلے پن کی جگہ یگانگت اور ہم آہنگی کے احساسات ابھرتے ہیں۔ بااین ہمہ میرے خیال میں اس پورے عمل (Process) کے دوران حق و باطل، غلط و صحیح اور اچھائی بُرائی کے امتیازات انسان کے پیش نظر رہنے چاہئیں۔ کیونکہ اپنے ارادے کی آزادی (Free will) کو حق بات کے جھٹلانے کی

خاطر استعمال کرنا نہ صرف آزادی کا غلط استعمال ہے بلکہ اس کے نتائج انسانیت کے لیے نقصان دہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا فرد کو اپنی خودمختاری کے ساتھ اپنی ذمہ داری کا احساس بھی ہونا چاہئے۔

ماہر نفسیات عبدالحمید کے مطابق ''فرام کا خیال ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام نے فرد کی زندگی کے حالات قدرے بہتر ضرور بنائے ہیں، لیکن اس کے لیے انسان کو بھاری قیمت ادا کرنی پڑی ہے۔ اس کی ذاتِ چھن گئی، عزت نفس کا احساس مٹ گیا، اکیلے پن اور بے چارگی کے احساس سے دو چار ہوا، انسانی اقدار کا خاتمہ ہوگیا، دوسروں کے ساتھ مخلص کاروباری اور مشینی رشتہ باقی رہ گیا۔ اپنے کھوئے ہوئے وقار، عزت نفس، باہمی یگانگی، ہم آہنگی اور پیار کا متلاشی انسان اپنے اکیلے پن کے احساس کو کم کرنے کے لیے کئی طریقے اپناتا ہے لیکن سکون پھر بھی نہیں ملتا۔'' فرام کے مطابق ان طریقوں میں اطاعت پسندی (Submissiveness) کا ایک طریق ہے۔ اس ردِعمل میں انسان اپنی ذات کو کسی بیرونی طاقتور چیز سے جوڑ کر خود کو اکیلا محسوس نہیں کرتا۔ طاقتوروں سے دبنا کمزوروں کو ذلیل کرنا ایسے لوگوں کا عمومی طرزِ عمل بن جاتا ہے۔ کچھ لوگ دوسرا طریقہ تخریبیت (Destructiveness) کا استعمال کرتے ہیں۔ اس صورت میں فرد اپنی بے بسی اور عدم تحفظ کے احساس کو دور کرنے کے لیے جارحیت پر اتر آتا ہے۔ جن افراد کو وہ اپنے مسائل کی وجہ سمجھتا ہے، انہیں کچلنے کے درپے ہوجاتا ہے۔ اور اکثر اوقات وہ اپنے عمل کو حق بجانب قرار دینے کے لیے کوئی مذہبی جواز تلاش کر لیتا ہے اور یوں بزعم خود احساس جرم سے بچا رہتا ہے۔ میرے خیال میں فرام کا زمانہ اچھا تھا جب صرف اپنے مسائل کی وجہ سمجھنے والے کو جارح، جارجیت کا نشانہ بناتا تھا، ہمارے زمانے میں یہ تمیز ختم ہوچکی ہے۔ اس سلسلے میں ایک اور طریقہ میکانکی مطابقت (Automation Conformity) کا ہے۔ اس قسم کے لوگ اپنی ذات کو نظرانداز کر کے دوسروں خصوصاً دولت منداور مقبول لوگوں کا طرزِ عمل اپنا کر اپنے اکیلے پن اور تشویش وغیرہ کے احساسات کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے لوگ مقبولِ عام اشیاء استعمال کرتے ہیں، معروف سٹوروں سے خریداری کر کے خود کو اہم لوگوں میں شامل تصور کرتے ہیں، مشہور اور مقبول خیالات اور چیزوں کو فوراً اپناتے ہیں اور اشتہارات سے جلد متاثر ہوتے ہیں۔ عبدالحمید کے نزدیک ''ہمارے ملک میں درمیانے طبقے کے زیادہ تر لوگ اسی قسم کا انداز زندگی اپنا کر تشویش اور اکیلے پن کے احساس کو کم کرتے ہیں۔''

نفسیاتی لحاظ سے فرد کے اپنی پوشیدہ تخلیقی اور تعمیری قوتوں کو بروئے کار لانے اور اپنی ذات کے اثبات و نمو کے لئے ایرک فرام کے نظریات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی لیے عبدالحمید کہتے ہیں۔ ''فرام سے پہلے کسی محقق نے شخصیت کی تشکیل کے عمل کو سمجھنے کے لیے روزمرہ زندگی کے معاشی اور معاشرتی حالات کا بھرپور انداز سے جائزہ نہیں لیا۔ دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ فرام کے نظریات نے نفسیات کو ایک نئے رُخ پر ڈالا اور واضح کیا کہ معاشرے کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات کس طرح فرد پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کی شخصیت کی تعمیر کرتے ہیں۔ آج کے انسان کی سراسیمگی اور بیگانگی کو فرام

کے نقطہ نظر سے بڑی آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔'' نفسیات دانوں میں ایک مکتبِ فکر کے ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ فرد کی شخصیت بنیادی طور پر آموزش (Learning) کے نتیجے میں تشکیل پاتی ہے اور اس عمل میں فرد کا گردو پیش کا ماحول مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔ اس مکتب فکر کو کردار یت پسند اور ان کے نظریات کو Behaviouristic theorixes of Personality کہا جاتا ہے۔ آموزش کے اصولوں کا اطلاق کئی طریقوں سے کیا جاتا ہے، جن میں دو نظریات بڑے مشہور ہیں۔ پہلا ڈالرڈ اور ملر کا آموزش پر مبنی نظریۂ شخصیت (Dollard and Muller's learning theory of personality) کہلاتا ہے، جس میں دو امریکی ماہر نفسیات جان ڈالرڈ اور نیل۔ ای۔ ملر نے تشریط (Conditioning) کے اصولوں کو بنیاد بنا کر شخصیت کی تشکیل کا نظریہ پیش کیا۔ اور دوسرا طریقہ معاشرتی آموزش پر مبنی نظریۂ شخصیت کا (Social learning theory of personality) ہے یہ نظریہ بھی ایک امریکی کرداریت پسند محقق ابرٹ بندورا نے پیش کیا تھا۔ اس کے نظریات پر بقول عبدالحمید کئی اعتراضات کئے گئے ہیں جن میں ایک اہم اعتراض یہ ہے کہ ''اس نظریئے کی بنیاد جانوروں کے مطالعات سے حاصل ہونے والی اطلاعات اور نتائج پر رکھی گئی ہے۔ جبکہ انسانی کردار پر ان نتائج کا اطلاق کرنے کے لئے انسانی کردار کا وسیع پیمانے پر تجرباتی مطالعہ ضروری ہے۔'' شخصیت کی تشکیل کے انسانیت پسند نظریات (Humanistic theories of Personality) پر پہلے ہی کارل راجرز اور ابراہام ماسلو کے ضمن میں بات ہو چکی ہے۔ شخصیت کے موضوع پر لکھنے والے یہی تین مکاتیبِ فکر ہیں (1) تحلیل نفسی (2) کرداریت پسند اور (3) انسانیت پسند۔

انسانی شخصیت کے اوصاف، شعوری اور غیر شعوری اعمال وغیرہ پر کافی گفتگو ہو بھی چکی ہے مگر شخصیت کا پھیلاؤ یا گیرائی اور اس کا عمق یا گہرائی نیز اس کے رجحانات، میلان طبع، اقدار و رویے اور تعینات کے بے شمار پہلو ہیں جن کا ایک مضمون میں احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ ماہرین نفسیات نے ان پہلوؤں کے علاوہ شخصیت کے باطنی مثلاً لاشعوری محرکات وغیرہ کے عمیق گوشوں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے مگر شخصیت کے مختلف نظریات کے بنیادی تصورات کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں بنیادی قسم کے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ یعنی انہیں ملا کر شخصیت کا ایک مکمل، مربوط اور معروضی نظریۂ تشکیل نہیں دیا جاسکتا۔ عبدالحمید اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں۔ ''دراصل فرد کے کردار کی تہہ میں کام کرنے والے محرکات اور عوامل اس قدر پیچیدہ اور گوناگوں ہیں کہ اکثر اوقات ان کا احاطہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔'' انسانی شخصیت کے پیچ در پیچ اسرار و رموز، اس کے ہر لحہ بدلتے ہوئے خیالات، ارادے اور سوچ اور نفسی و طبیعی نظاموں کے امتزاج و اشتراک پر مبنی حرکی و متغیر تنظیم انسانی کو سمجھنے کے لیے نفسیاتِ عمق (Depth psychology) کی مدد ضروری ہے۔ یہ نفسیات کی وہ عہد آفریں شاخ ہے جس نے نہ صرف نفسیات کے علم کا رخ بدل دیا بلکہ انسان کے تصور ہی کو بدل ڈالا۔ بقول پروفیسر ساجدہ نفسیات کی اس شاخ نے ''انسان کے اشرف المخلوقات کے منصب کا تصور ایک ایسے مجموعہ خیر و شر سے بدل دیا جس میں محض تخلیق و تعمیر و خیر کی

صورتیں ہی جلوہ گرنہیں ہیں، بلکہ جس کے بطن میں تخریب کاری اور جارحیت کی قوتیں بھی اسی شد و مد سے عمل پیرا ہیں۔ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو اپنے جبلی افعال میں جانوروں سے زیادہ مختلف نہیں۔'' پروفیسر صاحبہ کی یہ بات تو میرے خیال میں درست ہے کہ انسان اور حیوان میں جبلی تقاضات تقریباً یکساں ہوتے ہیں۔ مگر ان کا یہ کہنا سمجھ میں نہیں آیا کہ تعمیر وخیر کی قوتوں اور تخریب وشر کی قوتوں کا مجموعہ ہونے کی بنا پر انسان کے اشرف المخلوقات کا منصب کیسے بدل گیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انہی دو متضاد قوتوں پر کنٹرول کی وجہ سے ہی انسان کو یہ اعلیٰ منصب عطا کیا گیا ہے۔

شخصیت کی نفسیات (Psychology of Personality)، پروفیسر ساجدہ کے مطابق ''علم نفسیات کی شاید سب سے زیادہ پیچیدہ اور جامع شاخ ہے۔ یہی وہ علم ہے جو انسانی نشوونما کے زمانی ومکانی، داخلی اور خارجی، شعوری اور لاشعوری ہر پہلو کا احاطہ کرنے کا داعی ہے۔ اور یہی وہ نفسیات کی واحد شاخ بھی ہے جس کا علم اور تجربی مطالعہ محض انسانوں کے مشاہدے پر مبنی ہے، جبکہ ہم نفسیات کے اکثر شعبوں میں جانوروں کے تجربی مطالعے کی مدد سے نظریہ سازی میں استفادہ کرتے ہیں۔۔۔ لیکن انسانی شخصیت کی نفسیات کا علم جانوروں کے تجربی مطالعے کی مدد سے ممکن ہی نہیں ہے۔ اس امر سے قطع نظر، کہ انسانی نفسیات کے دوسرے شعبے بھی جانوروں پر کیے گئے تجربوں سے کسی حدتک اعتبار کا درجہ حاصل کرسکتے ہیں۔'' شخصیت کی تعریف میں بھی اختلاف پائے جاتے ہیں۔ آلپرٹ (Allport) کے خیال میں ''شخصیت فرد کی ذات کے اندر ان طبیعی اور نفسی نظاموں کی حرکی تنظیم ہے جو انسان کے منفرد فکر وعمل کا تعین کرے۔'' یعنی شخصیت کوئی جامد شے نہیں بلکہ حرکی تنظیم ہے جو ہمہ وقت حرکت میں رہتی ہے۔ پروفیسر صاحب کے مطابق نفسی نظاموں کی یہ حرکی تنظیم، فرد کی ذات کے اندر ہوتی ہے۔ بیرونِ ذات اس کا وجود نہیں۔ ہاں بیرون ذات اس کے محض اظہارات اور محرکات ہوسکتے ہیں۔ شخصیت کے ضمن میں تحرک، تغیر، تبدیلی اور ارتقا پر ایک امریکی ماہر نفسیات Floyd.I.Ruch نے اپنی تصنیف "Psychology and life" میں تفصیل سے بحث ووضاحت کی ہے۔ اس نے اپنی کتاب کی ابتداء ہی عظیم ونامور دانشور تھامس کارلائل کے ان الفاظ سے کی ہے۔ " A hundred years ago Thomas Carlyle had this to say: " Today is not yesterday, we ourselves change, how can our works and thoughts always the same."

انسانی شخصیت کی ایک اور تعریف جرسلڈ نے یہ کی ہے۔ ''شخصیت فرد کی ان خصوصیات کا مجموعہ ہے، جن کا وہ بحیثیت ایک منفرد ومخصوص انسان کے، حامل ہے۔'' اس تعریف کے مطابق شخصیت ایک تنظیم نہیں بلکہ مجموعہ ٹھہرتی ہے۔ میکڈونلڈ کی تعریف کے تحت ''شخصیت فرد کے تمام کردار کی منفرد اور جامع تنظیم ہے۔'' جبکہ ہل گرڈ کے نقطہ نظر سے ''شخصیت کردار کی ان انفرادی خصوصیات کا نام ہے جو اپنی تنظیم کے ذریعے فرد کی اس کے تمام تر ماحول سے منفرد مطابقت کا تعین کرتی ہے۔'' واٹس کے نزدیک ''شخصیت ہمارے عاداتی نظام کا مجموعہ ہے۔ جس کا مطالعہ کردار کے ذریعے کیا جاتا ہے۔'' ان تعریفات میں

انسانی شخصیت کی انفرادیت کو اہمیت تو دی گئی ہے مگر ماہرین کا اعتراض ہے کہ یہ تعریفیں نہ تو حرکی نظامِ شخصیت کا احاطہ کرتی ہیں، نہ شخصیت کی گہرائیوں کا، نہ اس کے تغیرات کا اور نہ ہی یہ شخصیت کی ارتقائی کیفیت کی طرف کوئی واضح اشارہ کرتی ہیں۔ ان تعریفات میں رفتار کا نہیں بلکہ انجماد کا تصور ابھرتا ہے۔ اس لحاظ سے نفسیات کے انسائیکلوپیڈیا کی تعریف زیادہ بہتر لگتی ہے کہ ''شخصیت فرد کے بنیادی اور عمومی طرزِ عمل کی بلندیوں اور شعوری طور پر تصورِ ذات کی پیمائش کا نام ہے۔ شخصیت کسی فرد کے جملہ انعکاسات، فطری میلانات، جذبات، علمی اور جسمانی استعداد کا وہ نظام ہے جو ہمیشہ تغیر و تبدل کے قانون کے زیر اثر رہتا ہے۔'' ان تعریفوں کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک دوسرے کے نفی نہیں کرتی بلکہ ہر تعریف میں شخصیت کے کسی ایک پہلو پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ جناب عبدالحمید نے ان تعریفوں کی روشنی میں ایک ''جامع'' تعریف کرنے کی یوں کوشش کی ہے۔ ''شخصیت فرد کی کم و بیش مستقل اور منفرد خصوصیات کی متحرک تنظیم ہے۔ ان خصوصیات میں فد کے مخصوص کرداری نمونے، رویئے، محرکات، ہیجانات، میلانات، عقائد اور خیالات وغیرہ شامل ہیں۔ وہ گرد و پیش میں ہونے والے واقعات، اشیاء اور افراد کے بارے میں مخصوص انداز میں سوچتا ہے، احساسات کا اظہار کرتا ہے اور خاص ردِ عمل پیش کرتا ہے۔'' شخصیت نفسیات کا ایسا وسیع اور اہم موضوع ہے جس کے مطالعے کے لیے دیگر موضوعات جیسے ادراک، محرکات، رویئے، آموزش، ہیجان، نشو و نما اور حافظے وغیرہ سے حاصل کردہ معلومات کو اکٹھا کیا جاتا ہے۔ Floyed.L.Ruch نے اپنی تصنیف میں نفسیات کے تقریباً تمام نظریات کا احاطہ کیا ہے۔ اس نے انسانی شخصیت کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

انسانی شخصیت کی اصطلاح کے بارے میں رُچ (Ruch) کا کہنا ہے کہ اس سے مراد کوئی خاص معیاد یا کوئی ایک پیمانہ نہیں۔ اس کے مطابق شخصیت کی تقریباً پچاس تعریفیں ہیں جو زیادہ تر "Most of these definitions attempt in one way, or another to include the whole person. - all the abilties, tendencies and other innate or acquired characteristics that are more or less consistent from one day to the next and distinguish him from other person." یہ کہتے ہیں کہ معاشرتی سائنس کے ماہرین جب لفظ شخصیت کا استعمال کرتے ہیں تو ان کے سامنے فلمی ستاروں یا سیاستدانوں کی پُر اسرار (Mysterious) شخصیات نہیں ہوتیں بلکہ وہ عام فرد کی تین خصوصیات میں سے ایک کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو یہ ہیں۔

(1) His external appearance and behavior, or social stimulus value, Awareness of self as a permanent organizing force in his life, or (3) (2) His particular pattern or organization of measurable traits both inner and outer ones."

انسانی خصوصیات (Traits) کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ ابھی تک ان کی کوئی تعداد سامنے نہیں آئی تاہم But one early study, listed 17, 953 (Allport and Odbert 1936).The study of personality is especially dixfficult because each personaltiy is infinitely complex and contains apparantly contradicting aspects. As one " psychologist has expressed it."

یہ سائیکالوجسٹ مسٹر مرے (Marray) ہیں جنہوں نے شخصیت کے مختلف اور باہمی متضاد پہلوؤں کی بڑی مہارت اور خوبصورتی سے نشاندہی کی ہے۔ جیسا کہ رُچ نے بیان کیا ہے۔ " A personality is a full congress of orators and pressure groups, of childrens, demogogues, Communists, Isolationists, war-mongers, mugwamps, grafters, log-rollors, lobbyists, ceasars and christs. Machiavellis, and Judases, Torries and Promethean revolutionists." رُچ کے مطابق کچھ ماہرین نفسیات نے زور دے کر اثباتِ ذات کے نظریے کو پیش کیا ہے۔

" From early childhood, the individuals concept of self is an important factor in guiding both his immediate behavior and the further development of his personality."

شخصیت کی نفسیات کو سمجھنے کے لیے اس امر کا ادراک ضروری ہے کہ انسانی شخصیت مختلف النوع کرداری، تحرکی جبلی، شعوری، لاشعوری، فعلی اور امکانی عناصر کا ایک ایسا تنظیمی مجموعہ ہے جو ہمہ وقت تغیر پذیر اور نمو پذیر ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایک مسلسل اور مربوط اکائی ہے۔ عبدالحمید کا کہنا ہے کہ شخصیت کا تصور عام ہونے اور اس کے بارے میں بہت کچھ جاننے کے باوجود اس کی صحیح نوعیت اور حقیقت کے بارے نہ صرف عام لوگوں میں بہت سے غلط تصورات پائے جاتے ہیں، بلکہ ماہرین میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ شخصیت کے ضمن میں سب سے پہلے متعلقہ شخص کا جسمانی حلیہ سامنے آتا ہے، یعنی فرد کے خدوخال، قد، چال ڈھال او رلباس وغیرہ جنہیں دیکھ کر ایک فرد کو اچھا یا بُرا سمجھا جاتا ہے۔ اسے قیافہ شناسی (Physiognomy) کہا جاتا ہے۔ اسی طرح دست شناسی، علم نجوم، علم الاعداد اور علم دماغ (Phrenology) وغیرہ جیسے علوم بھی عوام وخواص میں بڑے مقبول ہیں، مگر عبدالحمید نے ایسے تمام تصورات کو بے بنیاد اور غیر سائنسی قرار دیا ہے۔ فلائیڈ رچ نے بھی ایسے علوم کو غیر حقیقی قرار دیا ہے۔ فرینالوجی کے بارے میں اس کا کہنا ہے کہ دماغ میں ایسی کسی صلاحیت کا سراغ نہیں ملا۔ " Modern research has found no thing to support the existence of " faculties as they were conceived by the Phrentologists.

The only type of brain localization that actually is of general types of function - motxer, censor, speech and so on, as we have seen."

اسی طرح چہرہ شناسی (Physiognomy) کے بارے میں رُچ کا کہنا ہے کہ:

"Many people still believe in physiognomy, the art of judging personality from facial characteristics. But the accuracy of such Judjments is open to question.

زیادہ تر ماہرین نفسیات اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ شخصیت ایک حیاتیاتی طبعی وقوعہ (Biophysical event) ہے۔ مگر ایک دوسرے کی دی ہوئی تعریف سے کلیتاً اتفاق نہیں کرتے۔ شخصیت کی متعدد نفسیاتی تعبیریں پیش کی گئی ہیں اور بقول پروفیسر ساجدہ، ان تعبیروں کے تحت بے شمار تعریفیں کی گئی ہیں مگر پھر بھی یہ تعریفیں مکمل طور پر شخصیت کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتیں۔ پروفیسر صاحبہ اس کی وجہ یہ بتاتی ہیں۔ ''انسانی شخصیت کے اسرار ورموز کی عقدہ کشائی کی ابتدائی کوشش بھی ایک لرزہ خیز تجربہ ہے۔ انسان مخلوقاتِ عالم کی پیچیدہ ترین نوع ہے۔ جو عقل وبصیرت، جبلت وشعور، محبت وخشونت، ادراک واحساس، الوہیت وشیطنت، ارتقاعی صلاحیت وذہنی پستی، اعلیٰ وادنی اور حسن وقبح کے ایسے ایسے تضادات سے نوازی گئی ہے جن کی یکجائی انسانی تخیل اور فہم سے پرے بے حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان کا بحیثیت ایک نوع کے تصور، ان تضادات کو سمجھے بغیر ممکن بھی نہیں ہے۔'' کچھ تعریفوں کے مطابق شخصیت ایک ایسا ''نظام'' ہوتی ہے جو مراتب کے اعتبار سے مختلف سطحوں میں منقسم ہوتی ہے اسے شخصیت کا درجاتی تصور بھی کہا جاتا ہے۔ اس نوع کی تعریفوں میں ولیم جیمس نے ذات کے چار درجات متعین کیے ہیں۔ اس کے نزدیک ذات دراصل شخصیت ہی کے باطنی نقطہ نظر سے مشاہدہ ہے۔ اس کی تقسیم کے مطابق ذاتِ انسانی کے چار درجات ہیں (1) ذاتِ مادی یعنی انسان کا جسم اس کی مادی ملکیتیں، دوست احباب وغیرہ (2) ذاتِ سماجی یعنی وہ ذات جو انسان سماجی رشتوں، شہرت اور پہچان سے حاصل کرتا ہے۔ (3) ذاتِ روحانی یعنی ذات کا وہ پہلو جو انسان کی منتشر شخصیت میں ربط وآہنگ پیدا کرتا ہے۔ اور ذات کا چوتھا درجہ ولیم جیمس کی نظر میں خالص ایگو یا انا ہے۔ جو اگرچہ ذاتِ روحانی سے الگ نہیں لیکن جس کی نفسیاتی تعبیر میں نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ لفظ شخصیت کا انگریزی مترادف "Personality" ہے یہ ایک لاطینی لفظ "Persona " سے ماخوذ ہے جو سٹیج پر اداکار بطور ماسک استعمال کرتے تھے یعنی نقلی چہرہ۔

پروفیسر ساجدہ نے انسانی شخصیت کی تخلیقی صلاحیتوں کا نفسیاتی جائزہ بھی لیا ہے اور انسان کی اس صلاحیت کو بڑی اہمیت دی ہے۔ وہ کہتی ہیں ''اگر کہا جائے کہ قدرت نے انسان کو جتنی صلاحیتیں ودیعت کی ہیں ان میں ارفع ترین صلاحیت تخلیقیت ہے تو بے جا نہیں ہوگا۔ تخلیقیت انسانی نفسیات میں مضمرہ قوت ہے جو ایک طرف تو سماجی ''تہذیبی'' اور تمدنی ارتقا کی ضامن

ہے، اور دوسری طرف فرد کی نموئے ذات، آگاہی ذات، اظہارِ ذات اور اثباتِ ذات کا اعلیٰ ترین ذریعہ ہے، جو تاریخ کے ہر دور میں انفرادی اور سماجی ارتقاء کی ضامن رہی ہے اور زماں و مکاں کی قید سے آزاد ہے۔ تاریخ کا کوئی دور ایسا نہیں گزرا جبکہ انسانی تخلیقی قوتوں کا اظہار علم و ادب، رقص و موسیقی، مصوری اور تعمیرات، اور سائنس کی دریافتوں میں نہ ہوا ہو۔ ماقبل تاریخ کی دریافتیں، غاروں کی مصوری، ظروف سازی اور پانچ ہزار سال قبل مسیح کی تہذیبی باقیات کا علم بھی اس کی شہادت دیتا ہے کہ انسان اپنی ارتقاء کے ہر دور میں تخلیقی قوت کا اظہار کرتا رہا ہے۔ اس کی تحریک صرف مادی ہی نہیں بلکہ ایک ذہنی اپج (Stimulus) نے بھی اسے اظہار پر اکسایا ہے جس کا تعلق اس کی ضروریاتِ زندگی سے نہیں بلکہ جمالیاتی حس (Aesthetic sense) سے ہے۔ ایک اندرونی ذہنی و جذباتی تحریک سے ہے۔'' اس میں عزت و وقار، منصب اور جاہ و حشم سے زیادہ قابلِ قدر ہے۔

تخلیقیت میں نفسیاتِ عمق کے کردار کے حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ تحلیل نفسی اور نفسیاتِ عمق کے مطالعے سے ''یہ انکشاف ہوا ہے کہ انسان کے تخلیقی کارناموں کے پسِ منظر ذہن کی وہ قوتیں بھی کام کرتی ہیں جو شعور کے دائرے میں نہیں آتیں۔ بلکہ لاشعور کی کارکردگی کہلائی جاسکتی ہیں۔'' اس عمل میں فرائڈ کے لاشعور کے علاوہ ژونگ کے اجتماعی لاشعور کی کارفرمائی بھی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فنکار بعض اوقات اپنی تخلیقات میں ایسے ایسے انکشافات کرتے ہیں اور اس طرح کے خیالات، الفاظ اور علامات کا اظہار کر دیتے ہیں جو بقول پروفیسر صاحبہ ''ہمارے ذاتی تجربے اور علم کا حصہ نہیں ہوتے جو بوقتِ تخلیق ایک کوندے کی طرح لپک جاتے ہیں اور تخلیقی عمل میں معاون ثابت ہوتے ہیں اور کبھی کبھی تخلیق کا رخ ہی بدل دیتے ہیں، جس کی کیفیت کو تخلیق میں الہامی اور باطنی تجربہ کہا جاتا ہے۔'' تخلیقی عمل میں احساسِ جمال اور حسن شناسی (Eye for beauty) کے ضمن میں کہتی ہیں ''تخلیقی تجربے کا ایک پہلو حسن شناسی ہے۔ جو چیزیں احساس جمال کو آسودہ کرتی ہیں ان پر گہری نظر رکھنا حسن شناسی ہے۔ تخلیقی عمل میں توازن، تناسب، ہم آہنگی، نغمگی اور حسن و جمال کی پاسداری کرنا جمالیاتی احساس کا ایک پہلو ہے۔ فنی اظہار میں مضمر فنکار کا ایک وصف اس کا تخلیقی تجربہ بھی ہوتا ہے۔ جو بکھری ہوئی اشیاء غیر مربوط مظاہر اور مختلف النوع تجربات اور واقعات میں ایک گہرا ربط پیدا کرتا ہے۔ ایک تسلسل کی تخلیق اور غیر مربوط عناصر کو ہم آہنگ اور مکمل اکائی میں تبدیل کرتا ہے۔ مثلاً غالب کا ایک شعر ہے ۔

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

یہاں غالب نے موت، زیست اور غم کے تصورات میں ربط پیدا کیا ہے۔ غم جزدِ زندگی ہے اس سے مفر صرف موت میں ہی ممکن ہے۔ دوسری طرف شمع کے رات بھر جلتے رہنے کو عمر بھر غم جھیلتے رہنے کے تجربات کا ہم معنی قرار دیا ہے اور تیسری طرف موت کے آنے اور سحر کے ہونے کو ایک حقیقت کا مفہوم دیا ہے۔ اب سوچ کر دیکھیے ایک شعر کا معجزہ! جس میں موت،

حیات، غم، شمع اس کا ہر رنگ میں جلنا، سحر ہونا اور سحر ہونے تک شمع کا جلتے رہنا ان سب مظاہر کو ایک زنجیر میں پرو دیتا ہے۔ ربط وتسلسل، نظم وضبط کے ایک سانچے میں ڈھال دیا ہے اور یہ شعر معنی ومفہوم کے ایک جہاں کی تخلیق کرتے ہوئے ایک مکمل اکائی میں ڈھل گیا ہے۔ یعنی تخلیقی تجربے کا ایک اہم بُعد۔

شہزاد احمد کے مطابق فرائڈ اپنے دوسرے دور میں سائنسدان کی بجائے فلسفی سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ دراصل فرائڈ جنس، سادیت، مساکیت اور خاندانی ایڈی پس کے نظریات کو جتنی وسعت دے سکتا تھا، دے چکا تھا۔ لہٰذا پہلی جنگ عظیم کے بعد پیدا ہونے والی صورتحال مثلاً جنگی جنوں اور تشدد و تخریبی رجحانات کے سوال کا جواب دینے سے قاصر تھا، اس لیے بقول شہزاد احمد ''دوسرے دور میں فرائڈ نے جو نظامِ فکر تشکیل دیا وہ اسٹیفن ہاکنگ کی طرح جدید نظریاتی طبعیات کی طرح تھا، جسے قبول یا ردِ کرنا بے حد مشکل ہوتا ہے۔ یہ نظریات ایسے نہیں جن کی تصدیق کلینک کی سطح پر کی جاسکتی ہو۔ یہ نظریات سائنس کی عمومی سطح کو توڑ کر فلسفے کے میدان میں داخل ہوتے نظر آتے ہیں۔'' اس طرح ابتداء میں فرائڈ نے ایک پورا نظامِ فکر تشکیل دیا تھا'' اور پھر اس میں وہ وسعتیں پیدا کرتا گیا اور ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ اس نے اپنے بنائے ہوئے نظام کی بجائے ایک نیا نظام متعارف کروایا۔ یہ رویہ اس کے دیر تک فعال رہنے کی دلیل ہے۔ وہ اپنی موت تک خاصا فعال رہا اور زندگی کے بارے میں نئی نئی رائیں اور افکار سوچتا رہا۔ اس نے مختصر کتابوں مثلاً Totem Taboo وغیرہ میں نہ صرف ایگو، سُپر ایگو اور ID وغیرہ کی وضاحتیں کی ہیں بلکہ مذہب، تہذیب، قوت، جنگ، مقصد حیات اور دوسرے کئی معاشرتی عوامل کا مطالعہ بھی کیا ہے اور ان کو سمجھنے کی بھی کوشش کی ہے جو فرد یا معاشرے میں بے اطمینانی کا باعث ہیں۔

شہزاد احمد نے بھی مذہب کی وضاحت کی ہے، مگر مذہب (دین) کے وحی کے پہلو سے صرف نظر کرتے ہوئے اسے مذہبی واردات کے تناظر میں نفسیاتی بنیادوں پر بیان کیا ہے۔ وہ مذہبی واردات کے مخالفین کے جواب میں کہتے ہیں کہ سائنس جو کسی اَن دیکھی یا انجانی بات پر ایمان لانے کی قائل نہیں، اپنی ابتداء کسی مفروضے سے ہی کرتی ہے اور خود مفروضے کو ثابت کرنا ضروری نہیں سمجھتی۔ اگر نفسیات سے پوچھا جائے کہ کیا زمین واقعی موجود ہے تو وہ اس کا جواب نہیں دے سکتی۔ وہ مذہب اور سائنس کو برابری کا درجہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کے اپنے اپنے دائرہ کار ہیں لہٰذا ''مذہب کے شعبوں میں سائنس کوئی علم مہیا نہیں کرتی اور مذہب اپنے طریقہ کار سے سائنس کی حدود پھاند کر اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں دے سکتا۔'' یعنی سائنس اگر مذہبی معاملات میں کوئی علم مہیا نہیں کرتی تو مذہب بھی سائنسی معاملات میں دخل اندازی کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتا۔ اسی طرح وہ صوفی اور پیغمبر کی مذہبی واردات کی تفریق کے ضمن میں کہتے ہیں کہ ''بنیادی طور پر دونوں تجربے ایک ہی رنگ اور ایک ہی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ مگر دونوں کا موازنہ کیا جائے تو پیغمبرانہ تجربہ بہت وسیع اور دور دراز تک اثر انداز ہوتا ہے۔'' اس سلسلے میں انہوں نے حضرت عبدالقدوسؒ کے قول کا بھی حوالہ دیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ''حضور نبی اکرمؐ

آسمان کی انتہائی بلندیوں تک گئے اور واپس آ گئے۔ اگر میں جاتا تو کبھی واپس نہ آتا۔ شہزاد صاحب کے مطابق فرائڈ مذہب کو ایک واہمہ (Illusion) اور مذہبی لوگوں کو بچگانہ ذہن کا حامل سمجھتا تھا جن کا تہذیب وتمدن کے ارتقاء سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مگر اس موقف کے برعکس وہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ ''خواہ ہم مذہب کو انسانی ذہن کی سب سے بڑی ترقی سمجھیں یا اسے اضداد کا مجموعہ سمجھیں، لیکن اس کے باوجود اس سے انکار ممکن نہیں اور خاص طور پر جہاں مذہب کا اثر زیادہ ہو اس کا مطلب اعلیٰ درجے کی تہذیب ہوتی ہے۔'' شہزاد احمد کے مطابق یہ بات درست ہے جہاں تہذیب نہ ہو وہاں مذہب بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔

شہزاد صاحب کے مطابق ''مذہب کوئی ایسی چیز نہیں جو استدلال کے ذریعے قبول کی جا سکتی ہو۔ وہ آہستہ آہستہ ذہن پر اثر انداز ہوتا ہے۔'' مگر مذہبی واردات پر نفسیات دانوں کی طرف سے اٹھائے گئے اعتراضات مثلاً یہ کہ مذہبی واردات بعض جسمانی تبدیلیوں کے باعث بروئے کار آتی ہے۔ جیسے بھوک، کم خوراکی، کم خوابی، ورزشیں، یوگا اور نشہ آور چیزیں، یا یہ کہ مذہبی تجربات کرنے والے تمام لوگ نیوراتی (Nueratic) ہوتے ہیں اور ان کا تجربہ محض فریب نظر (Hallucination) ہوتا ہے۔ یا تحلیل نفسی کے ماہرین کا یہ اعتراض جب ہم باپ کی قوتوں کو لامحدود کر دیں تو خدا کا تصور پیدا ہو جاتا ہے جو ایک مردانہ تصویر ہے اور اس کی آواز بھی مردانہ ہے، ایسے تمام اعتراضات کا جواب انہوں نے استدلالی علم کے ذریعے ہی دیا ہے۔

مثلاً خدا کے وجود کے بارے میں کہتے ہیں کہ ''مذہبی واردات کے لیے خدا کے وجود کی فلسفیانہ توجیہ سے واقف ہونا ضروری نہیں، مذہبی واردات کسی ایسے شخص کو بھی ہو سکتی ہے جو خدا کا سرے سے قائل ہی نہ ہو نطشے (Nietzche) میں ہمیں ایک ایسی ہی مثال ملتی ہے۔'' نطشے کا دعویٰ تھا کہ اس نے وجد کی حالت میں اپنی مشہور کتاب ''بقول زرتشت'' لکھی تھی۔ شہزاد صاحب کا کہنا ہے کہ مذہب کی اس وارداتی شکل میں روحانی ضروریات اور حصول علم کی خواہش کو ایک وقت میں پورا نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔ ''مذہب واردات کے طور پر نفسیات اور سائنس کی حدود سے باہر رہتا ہے۔ اس کی تجلیاں کسی نام نہاد علمی طریقے سے نہیں دیکھی جا سکتیں اور نہ ہی خردمند رویہ ہمیں ان واردات کے سمجھنے میں حد دے سکتا ہے۔ چنانچہ مذہب سائنس کی ترقی کے باوجود اس کی حدود میں شامل ہونے سے انکار کر دیتا ہے۔ سائنس کی تشریحات کسی طرح بھی مذہبی واردات کو نہیں سمجھ سکتیں۔ اس لیے مذہبی معاملات کے سلسلے میں ہمارا رویہ مذہبی ہی رہے تو بہتر ہے۔ وگرنہ ہمیں علم تو حاصل ہو جائے گا مگر وہ ہماری روحانی زندگی کی ضروریات کو پورا نہ کر سکے گا۔

قدحِ خرد فروزے کہ فرنگ داد مارا
ہمہ آفتاب لیکن اثرِ سحر نہ دارد

محترم شہزاد احمد نے مذہب یا مذہبی واردات کو سیکولر انداز میں پیش کیا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ مذہب میں انسان اور

خدا کا تعلق صرف پرائیویٹ سطح تک محدود رہتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی پوری زندگی لا دینی (Secular) نظام میں ڈھل جاتی ہے اور اس کا تعلق اجتماعی زندگی کے معاشرتی، معاشی، سیاسی، ثقافتی، تعلیمی اور عمرانی پہلوؤں سے یکسر منقطع ہوجاتا ہے، اور انسان صرف عقائد کی تلقین اور عبادت کے رسمی طریقوں کی ترغیب کے لیے مختص ہو کر رہ جاتا ہے۔

خدا رسولؐ اور آخرت کا کوئی اثر اس معاشرے میں باقی نہیں رہتا۔ یوں بقول برہان احمد فاروقی ''ان اجتماعی شعبوں سے بے دخل ہوجانے اور عقیدے، عبادت اور علوم دینیہ کا اجتماعی زندگی کے کسی پہلو سے باقی نہ رہنے کا اثر یہ ہوا کہ عقیدہ وہم بن کر رہ گیا اور عبادات رسوم وظواہر میں تبدیل ہوگئیں۔'' محترم شہزاد صاحب نے مذہبی واردات کے سرچشمہ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ علامہ اقبالؒ نے بے شک مذہبی واردات پر بڑی لمبی بحث کی ہے لیکن انہوں نے وجدان کو انسانی فکر کا ہی ایک پہلو قرار دیا ہے، اس کو کسی باطنی علم سے منسلک نہیں کیا۔

وہ اپنے پہلے خطبے میں کہتے ہیں ''پھر اس امر کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ فکر اور وجدان بالطبع ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ دونوں کا سرچشمہ ایک ہے اور دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کا سبب بنتے ہیں۔'' وجدان کا بڑا فوئید برگساں بھی اسے ایک بلند نوعِ فکر (A higher king of intellect) قرار دیتا ہے۔ اسی طرح انبیاءؑ اور صوفیاؒ یا نبوت اور تصوّف کے خصائص و کوائف میں بنیادی فرق ہے۔ باطنیت ایک اکتسابی فن ہے جو مختلف قوائد وضوابط کے ماتحت ریاضتوں اور مشقتوں سے حاصل ہوتا ہے جبکہ نبوّت ایک وہبی شے ہے جس میں حقیقت خود اپنے آپ کو منکشف کرتی ہے۔ لہٰذا علم نبوّت اور کشف وجدان میں صرف درجہ (Degree) کا فرق نہیں بلکہ کیفیت، (Aualitative) کا فرق ہے۔ وحی سراسر معروضی ہے اور وجدان وغیرہ کی نوعیت یکسر موضوعی ہے۔

انسانی ذات کے بارے میں ژونگ کے خیالات آپکی نظر سے گذر چکے ہیں۔ آخر میں ذات کے بارے میں محترمہ ساجدہ زیدی کے نظریات پر ایک نظر ڈالتے چلیں۔ وہ کہتی ہیں۔

''اب ہم شخصیت کے ایسے پہلو کی طرف رجوع کریں گے جو انسانی شخصیت کا محور یا مرکز ہے جس طرح زمین اپنے محور کے گرد گھومتی ہے، اسی طرح شخصیت اپنی تمام نیرنگیوں کے ساتھ ذات کے گرد گھومتی ہے۔

جس طرح زمین کا محور کوئی مقام نہیں کوئی مادی یا جسمانی ساخت نہیں، یعہ اسی طرح انسانی ذات ہے کہ اس کو کسی شکل میں (Form) شے کی طرح سمجھا نہیں جاسکتا۔ وہ ایک ایسا خیالی مرکز ہے۔

جو شخصیت کی حرکیت اور فعالیت کا ضامن ہے۔ جو نظر نہیں آتی مگر ہے۔ جس پر شخصیت کے تمام پہلوؤں کے رنگ وآہنگ اور اس کی مخصوص نوعیت کا دارومدار ہے۔ ذات انسانی، انسان کے تمام وجود کا محور ومرکز ہی نہیں بلکہ اس کے تمام وجود کا حوالہ (Point of Reference) ہے۔

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب المراسلات

پرویز صاحب کی سوچ کی پیروی کرنے والوں کی ذہنیت پر اعتراض

ایک صاحب نے فیس بک پر درجِ ذیل تحریر پیش کر کے کمنٹس مانگے کہ:

لاشعوری طور پر آندھی تقلید:

حالانکہ علامہ پرویز صاحب کا میں دِل سے بہت احترام کرتا ہوں۔ پھر بھی مجھے یہ تحریر لکھنے کی ضرورت پیش آئی۔

مَیں بہت عرصے سے ایک بات کا مشاہدہ کر رہا ہوں، کہ اکثریت یہ کہتی ہے کہ ہم کسی بھی شخص سے عقیدت کی وجہ سے قرآن کی تعلیم کو نہیں مانتے بلکہ اس کی دلیل کی بنیاد پر مانتے ہیں، لیکن اکثر قرآنسٹ خاص طور پر علامہ پرویز کے منع کرنے کے باوجود ان کے ہی مفہوم وتشریح کو حرفِ آخر مان کر انہی کی باتوں کو آگے چلا رہے ہیں، اور خود بالکل غور فکر نہیں کرتے اور اگر کوئی محترم علامہ پرویز صاحب کی کسی بات کو دلیل کی بنیاد پر رد کر دے تو وہ دلائل سمجھنے اور اپنی اصلاح کرنے کی بجائے، اس بات پر اڑ جاتے ہیں کہ نہیں جی صرف علامہ محترم پرویز صاحب کا موقف ہی صحیح ہے باقی سب قرآن کا مفہوم غلط لکھ رہے ہیں۔ اسی طرح قرآن کا مفہوم اور تشریح دیگر قرآنسٹ عالموں کے پیروکار کر رہے ہیں، جس کو ایک دفعہ آئیڈیل مان لیا، بس اس کی ہر صحیح یا غلط بات کا دفاع کرتے رہتے ہیں، یعنی اُنہوں نے لاشعوری طور پر اپنے اندر فرقہ بندی پیدا کر لی ہے۔ ماجد احمد خان

اِس تحریر کے جواب میں، مَیں نے یوں وضاحت پیش کی کہ:

آپ کی بغیر فُل سٹاپ یعنی بغیر سانس لئے تحریر پڑھ کر متاثر ہوا۔ اگر آپ جیسے اصحاب کی مُثبت سوچ لئے ہوئے اصلاح کی خواہشمند تنقید کسی ادارہ کو ملتی رہے تو اُس کے لئے منفعت کا سامان ہی مہیا کرتی ہے۔

مَیں آپ سے سو فیصد مُتفق ہوں کہ پرویز صاحب کی سوچ سے آگے ضرور بڑھنا چاہئیے، لیکن یہ اُنہی حضرات کے لئے ممکن ہوگا جو پہلے اُن کی سوچ تک پہنچ چکے ہوں۔ لہٰذا ہمارا پہلا ہدف تو پرویز صاحب کے موقف تک کی آگاہی ہوگا، تاکہ ہم یہ ہدف عبور کر سکیں۔

مَیں تو پچھلے بیس سال سے دن رات اُن کے قرآن کو الحق ثابت کرنے کے دلائل کی سوچ کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش

میں لگا ہوں اور اپنی دوسری ہر قسم کی مصروفیات سے الگ ہو کر اپنی تمام توانائی اس ثبوت کی رسائی میں صرف کر رہا ہوں۔ اسی کے حصول کے دوران میں نے فلسفہ، عربی اور قانون کی تعلیم کے لئے باقاعدہ تعلیم بھی حاصل کی اور اسلامک سٹڈی میں ماسٹر، ایم فِل اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کی۔ اس کے علاوہ دو کتابوں کی تصنیف کرتے ہوئے درجنوں مقالہ جات بھی شائع کروائے۔ اِن کے باوجود بھی جب کبھی بھی قرآن کے موضوع پر مزید تحقیق کی ضرورت ہوتی ہے تو اِس کے لئے محترم پرویز صاحب کی تصانیف کا بھی گہری نظر سے جائزہ لیتا ہوں اور اُسے بار بار جاننے کے بعد دوبارہ اور سہ بارہ اُس کا مطالعہ کرتا ہوں تو اپنے علم کی موجود رسائی سے بہت آگے پاتا ہوں اور نئے زاویہ سے روشناس ہو کر اپنی فہم میں اضافہ کرتا رہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ آپ بھی محترم پہلے اس مشق سے نبرد آزما ہو کر اپنے علم تک کی رسائی کی قابلیت کا تجربہ ضرور کریں اور اگر کمی محسوس کریں تو اپنی قابلیت کے معیار کو محترم پرویز صاحب کے بار بار مطالعہ سے اُن کے دلائل سے پوری طرح آگاہی حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ اگر کامیابی میں ابھی مزید وقت کی ضرورت محسوس کریں تو تردد کی ضرورت نہیں، کیونکہ اُن کی تحقیق مزید کئی نسلوں کی تحقیقی ضروریات پوری کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اگر آپ علامہ پرویز صاحب کے دلائل کی پوری طرح واقفیت حاصل کر چکے ہوں اور اُن کے دلائل کے معیار سے اپنے آپ کو بلند محسوس کریں تو آپ کے علم تک رسائی پانے کی ہم لوگ بھی کوشش کرنے سے پیچھے نہیں رہیں گے، جس طرح ہم علامہ پرویز کے دلائل سے مستفید ہو رہے ہیں۔

جواب: میرے اس خط کا فوری جواب موصول ہوا کہ:

محترم انکل پیشگی معذرت کے ساتھ میں آپکی رائے سے متفق نہیں ہوں، آپکے خیال میں پہلے علامہ پرویز صاحب کی سوچ تک پہنچنا کیوں ضروری ہے؟ جبکہ اصل کتاب قرآن آپ کے پاس موجود ہے جس کی تعلیم تک پہنچنا اصل ضرورت ہے، باقی جتنے بھی عالم ہیں ان کی رائے سے فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں، اب آپ کے کمنٹ سے ہی یہ بات ظاہر ہوگئی آپ کیونکہ پرویز صاحب کو حرف آخر مانتے ہیں اس لیے جب بھی کسی الجھن کا شکار ہوتے ہیں تو علامہ پرویز صاحب کی رائے سے خود کو مطمئن کر لیتے ہیں کہ علامہ جتنی سوچ کسی کی نہیں سو علامہ پرویز صاحب کی ہی بات حرف آخر مان لی۔

مُعترض نے مزید یہ بھی فرمایا کہ:

محترم انکل آپ نے بہت خوبصورت انداز میں وضاحت کی۔۔مگر میرا اختلاف قرآن کے سمجھنے کے طریقے سے یا محترم علامہ پرویز صاحب سے نہیں ہے، میرا موقف یہ ہے کہ کیونکہ علامہ بھی ایک انسان تھے تو مختلف جگہوں پر الفاظ کے مفہوم کا چناؤ کرتے وقت ان سے بھی درست چناؤ نہ ہوسکا ہو۔

اِن سوالات کو مَیں نے ایک مُثبت سوچ کا نتیجہ سمجھتے ہوئے تفصیل سے جواب دیا کہ:

ماجد صاحب، آپ نے بہت عمدہ بات کہی ہے کہ قرآن کا نسخہ اور علم رکھتے ہوئے ہمیں کسی شخصیت کی سند کی ضرورت

نہیں رہتی۔

شخصیت پرستی کی ممانعت:

یہی بات قرآن میں بھی ہے کہ:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـــُٔوْلًا (17:36)

کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمھیں علم نہ ہو۔ یقیناً تمہاری سماعت و بصارت اور دل (Mind) یعنی انسان کے اپنے ہی ذرائع علم، سب ہی کی باز پُرس ہونی ہے۔

قرآن نے اس کے علاوہ بڑے واضح انداز میں اُمت کی آرا کو انسان پر مسلط کرنے سے روکا ہے۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔــلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (2:134)

یہ امت تو گزر چکی ہے جو انہوں نے کیا تھا وہ اُن کے لیے ہے اور جو تم کرو گے تمہارے لیے ہے اور اُس کے متعلق تم سے باز پرس نہ کی جائے گی جو وہ کرتے تھے۔

شروع ہی میں وضاحت کرنا چاہوں کہ یہاں مسئلہ محترم پرویز صاحب کی شخصیت اور سوچ کا نہیں بلکہ مَیں تو اسے خود قرآن اور اُس کی فہم کا لیتا ہوں۔ محترم پرویز صاحب کی تعلیم کا نکتہ ماسکہ ہی یہی رہا ہے کہ وہ شخصیت کو اہمیت نہیں دیتے تھے اور نہ ہی اپنی کہی ہوئی باتوں کو حرفِ آخر سمجھتے تھے۔ لہٰذا اُن کی سوچ سے مُتفق اصحاب سے بھی ایسی توقع نہیں رکھی جاسکتی۔

محترم پرویز صاحب کا اُن کی شخصیت کے تناظر میں تجزیہ کرنا ناانصافی ہوگی اور اُن کی سوچ کا اندازہ اور فیصلہ اُن کی زندگی بھر کے اسی تصور کے ثبوت فراہم کرنے سے لگایا جانا چاہیے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور مُطلق الحق ہے۔ اِس میں کسی قسم کے اختلافات نہیں پائے جاتے، اس لئے بھی کہ الحق ایک ناقابلِ تقسیم وحدت و توحید ہے، جس میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے بھی کہ اختلاف ہونے کی صورت میں حق، حق نہیں رہتا بلکہ باطل کی آمیزش سے آلودہ ہوجاتا ہے۔

لہٰذا علامہ پرویز صاحب کے مقام کا تعین ہم اُن کے دلائل سے کرتے ہیں جو اُنہوں نے قرآن کو الحق کے ثبوت دے کر اپنا فریضہ ادا کیا ہے۔ اِس ضمن میں اپنی تعلیمی کاوشوں کو آپ کے سامنے لاتے ہوئے یہ رائے وصول کرتے ہوئے تشنگی محسوس ہوئی کہ ہمارا مطالعہ صرف اور صرف علامہ پرویز کی سوچ تک محدود ہوکر رہ گیا ہے آپ اگر اپنے اعتراض میں ذاتی تجربہ اور سوچ سے آگاہ کر دیتے تو اُس کی روشنی میں بھی ہم اپنی مقدور بھر کوشش کرنے کے قابل ہوجاتے۔ ہماری معذوری یہی ہے کہ ہمیں کہیں سے پوری کاوشوں کے باوجود بھی سوچ میں مزید ارتقاء کے لئے وہ راہنمائی دستیاب نہیں ہوئی جو ہمیں علامہ پرویز کی طرف سے حاصل ہورہی ہے۔ لہٰذا مَیں آپ کے سوال کا تفصیلی جواب علامہ پرویز کی شخصیت سے قطع نظر کرتے ہوئے قرآن کے اختلافات وتضادات سے پاک الحق ہونے کے ثبوت میں دے رہا ہوں۔ میری نظر میں علامہ پرویز کے مقام کا اُن کی شخصیت کے حوالہ

سے نہیں بلکہ قرآن کے الحق کے ثبوت میں دیئے گئے دلائل کے ابلاغ کی کاوشوں کے اعتراف سے متعین ہوتا ہے۔

قرآن میں اختلافات اور تضادات ہونے کے اعتراض کا تجزیہ:

چونکہ گروہ بندانہ مفاد کا تقاضا یہ ہوتا ہے (خواہ وہ مذہبی فرقوں کی شکل میں ہو، یا سیاسی پارٹیوں کی صورت میں) کہ قوم کے سامنے، اس کے نظریہ حیات اور نصب العین زندگی کے متعلق کوئی متفق علیہ اور متعین مفہوم نہ آنے پائے، اس لئے یہ اعتراض وارد کر دیا جاتا ہے کہ قرآن بے شک ایک متعین کتاب کا نام ہے، لیکن اس کتاب کا مفہوم تو متعین نہیں، اس کی تعبیر تفسیری روایات کی مدد سے الگ الگ کی جاتی ہے۔

قرآن کے مفہوم و تعبیر میں اختلاف کا تجزیہ:

اس سلسلہ میں سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ (انسانی تصانیف میں بھی) ایک عمدہ کتاب کی بنیادی خوبی یہ قرار دی جاتی ہے کہ وہ اپنے مفہوم کو واضح اور متعین طور پر سامنے لائے۔ اگر کوئی تحریر ایسے الفاظ میں منضبط ہو کہ وہ ہر شخص کو اس کی منشاء کے مطابق (الگ الگ) معانی دے، تو وہ کتاب اعتناء کے قابل نہیں سمجھی جائے گی۔ جب انسانی تصانیف کے عمدہ ہونے کا معیار یہ ہے، تو ایک ایسی کتاب، جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ وہ کسی انسان کی نہیں، بلکہ انسانوں سے بلند و بالا، خود خدا کی تصنیف ہے، تو کیا اس کی کیفیت یہ ہوگی کہ اس کے الفاظ مختلف اور متضاد معانی دینے کے حامل ہوں؟

قرآن کے نظریات میں اختلاف نہ ہونے کا مفہوم۔ یہاں اختلافات سے پاک ہونا وضاحت طلب امر ہے۔ قرآن کے دعویٰ کے مطابق اختلافات کی گنجائش نہیں البتہ اِس سے اخذ کردہ نتائج اور دلائل و براہین تو انسانی کاوش کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اِس میں اختلافات سے پاک ہونے کا دعویٰ فقط ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے الفاظ میں یہ ہے کہ وہ علمی اور عقلی طور پر صحیح ہو۔ کسی تصور کا علمی اور عقلی طور پر درست ہونا، اِس کے سوا اور کوئی معنی نہیں رکھتا کہ وہ اِن تمام تصورات کے ساتھ مناسبت و مطابقت رکھتا ہے، جو عقلی و عملی طور پر درست مانے جا سکتے ہیں۔

صحیح تصورات کا امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ عقلی اور علمی نقطہ نظر سے ایک دوسرے کے معاون ہوتے ہیں لہٰذا وہ تصورات کا ایک ایسا مجموعہ بناتے ہیں، جس کے اندر غلط تصور داخل نہیں ہوسکتا۔ فلسفہ کی دنیا میں بھی ایسا نظریہ جس کے تمام تصورات ایک ہی مرکزی نظریہ سے ماخوذ ہوں، اُس میں حقیقی تضادات کا ہونا ناممکن ہے۔ ایسی حالت میں تضاد پڑھنے والے کے ذہن میں تو ہوسکتا ہے، لیکن جیسا کہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے وضاحت کی ہے، فلسفی کے ذہن میں نہیں ہوسکتا۔

ہم اِس مجموعہ سے کوئی تصور نکال کر اِس کی جگہ کسی غلط تصور کو نہیں رکھ سکتے۔ اگر ہم ایسا کریں تو وہ تصور اس مجموعہ سے غیر متعلق اور الگ تھلگ نظر آئے گا، اور اِس کی وجہ سے مجموعہ کے منطقی تسلسل میں ربط نہ رہنے کی وجہ سے حقیقت سے دور چلا جائے گا۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ جو لوگ قرآن سے اختلاف کرتے بھی ہیں، اُنہیں علم کی سند حاصل نہیں ہوتی بلکہ وہ ضد میں

آ کر ہی اختلاف کرتے ہیں۔

محترم پرویز صاحب کی شخصیت اور سوچ قرآن کے اختلافات سے پاک اسی الحق کے تصور سے وابستہ ہے اور اُن کے غلط یا صحیح ہونے کا معیار بھی یہی تصور ہے۔

آپ اپنے اعتراض میں اِس کی بھی تصدیق چاہتے ہیں کہ:

جن لفظوں کے معنی محترم علامہ پرویز صاحب نے لیے کیا وہ واقعی ہی قرآن کی تعلیم کے عین مطابق ہیں۔

میں آپ سے اس بات میں مُتفق ہوں کہ محترم پرویز صاحب نے عام روش سے ہٹ کر فہم القرآن کے اصول دئے ہیں جن کی وجہ سے اُنہیں بڑی تُند و تیز تنقید کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اُنہوں نے البتہ درجِ ذیل اصولوں کی کبھی خلاف ورزی نہیں کی اور نہ ہی اُن پر اس ضمن میں تنقید سامنے آئی ہے۔

فہم القرآن کے اصول:

1۔ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا ہے۔ لہٰذا اُسے اُس کی زبان یعنی نزولِ قرآن کے دور میں بولی جانے والی دورِ جاہلیت کی زبان سے سمجھنا ہوگا۔

2۔ قرآن خود اپنے کلام کی، تصریف آیات کی مدد سے، تفسیر کرتا ہے اور اپنی اصطلاحات کی خود وضاحت کر دیتا ہے۔ لہٰذا ہمیں اس اصول کو اپنانا ہوگا۔

3۔ قرآن کے مخاطب فرد کا تعلق کسی خاص دور کے فرد سے نہیں بلکہ قیامت تک کے ہر فرد اور دور سے ہے۔

قرآن کو سمجھنے کے لئے ہر دور کے فرد کو اپنے دور کی علمی تحقیق کی روشنی میں اپنی عقل و فکر سے سمجھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اسے آج کے دور میں علمی روش سے تعبیر کیا جاتا ہے اور علامہ اقبال نے اسلاف کی تقلید کے مقابل اس علمی روش کو اختیار کرنے پر زور دیا ہے۔

تفسیری روایات کی مدد سے قرآن کے الفاظ کے مفہوم:

ہمارے ہاں قرآن کا ایک خاص مفہوم متعین ہو چکا ہے، اور عرب ہوں، یا غیر عرب، ہر جگہ وہی متعین مفہوم رائج ہے۔ قرآن کے الفاظ تو بے شک وہی ہیں، لیکن ان الفاظ کا مفہوم، عجمی تصورات پر مبنی ہوتا ہے۔ جب قرآن نازل ہوا، تو ان اصطلاحات میں سے کسی کا وجود نہیں تھا، جو بعد میں فقہ، روایات، تصوف اور کلام وغیرہ کی رو سے پیدا ہوئیں، اور آہستہ آہستہ، دین کا جزو بنتی چلی گئیں۔ لہٰذا، عجمی تصورات کے تحت جو کچھ سمجھا جاتا ہے، وہ درحقیقت قرآن کا مفہوم نہیں ہوتا بلکہ وہ غیر قرآنی مفہوم ہوتا ہے۔ قرآن کے الفاظ کا مفہوم سمجھنے کا صحیح طریق یہ ہے کہ عجمی مفہوم کو صَرفِ نظر کر کے دیکھا جائے کہ محاورہ ءعرب میں اس کا کیا مفہوم لیا جاتا تھا، پھر دیکھا جائے کہ قرآن کریم میں یہ لفظ کہاں کہاں استعمال ہوا ہے، ان سب مقامات کو جمع کر لیا جائے تو تصریف آیات کی رو سے کسی خاص مقام پہ کسی خاص لفظ کا صحیح قرآنی مفہوم ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔

علامہ پرویز کے موقف پرتنقید کے لئے علمی روش:

پرویز صاحب نے اپنی تالیف ''لغات القرآن'' میں قرآن کے الفاظ کا ترجمہ اپنی طرف سے نہیں کیا اور نہ آج کے دور میں کوئی شخصیت ایسا کرنے کی پوزیشن میں ہے۔اُنہوں نے مستند ترین لغات کی مدد اور باقاعدہ حوالے دے کر لغات القرآن کی ترتیب و مدون کرنے کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔اب اگر علمی اور منطقی اصولوں پر اُن پر تنقید بنتی ہے تو صرف اس نشاندہی سے کہ:

1۔کیا مستند لغات سے مدد لی گئی ہے اور اُن کے صحیح حوالے دئے گئے ہیں۔

2۔کیا مستند حوالوں میں عربی زبان کے قوائد وضوابط کی پابندی کی خلاف ورزی سرزد ہوئی ہے۔

3۔وہ خود دعویٰ کرتے ہیں کہ اُنہوں نے جو الفاظ سے مفہوم لیا ہے، وہی مفہوم قرآن میں بیان کئے گئے انہی الفاظ کا دیگر عُلماء نے بیان کیا ہے۔کیا اُن کا دعویٰ باطل ہے اور وہ یہ ثابت کرنے میں نا کام رہے ہیں۔

عصرِ حاضر میں جبکہ اپنی طرف اور سند سے کسی دوسری زبان کا ترجمہ کیا ہی نہیں جا سکتا کسی بھی شخصیت پر اپنی طرف سے غلط ترجمہ کا الزام لگانا بلا جواز ہوگا۔

مجھے اُمید ہے کہ اس کے مطالعہ کے بعد آپ کو سوالات کے جواب مِل گئے ہوں گے۔مَیں محترم پرویز صاحب کی سوچ سے آگے نہ بڑھنے کی توجیہہ اس لئے کر رہا تھا کہ کسی بھی ہدف سے آگے بڑھنے کے لئے پہلے اُس ہدف تک پہنچنا لازمی ہوتا ہے۔جیسے کالج میں داخلہ لینے کی صلاحیت حاصل کرنے کیلئے پہلے میٹرک تک کی تعلیم پوری کرنی ہوتی ہے۔

غیر منطقی جذباتی اعتراضات:

بعض اوقات ہم اعتراضات کرتے وقت جذباتی بھی ہوجاتے ہیں۔مجھے یاد ہے کہ یونیورسٹی کے ایک سینئر پروفیسر نے مجھے بڑے فخر سے جتلایا کہ اُن کے والد محترم نے علامہ پرویز صاحب کو بھری مجلس میں چیلنج دیا تھا کہ وہ بغیر اعراب کے قرآن کی تلاوت کرنے کا اُن سے مقابلہ کریں۔اگر وہ بغیر اعراب کے پڑھنے میں کامیاب ہوگئے تو وہ مان جائیں گے کہ اُن کو یعنی محترم پرویز صاحب کو عربی زبان آتی ہے۔میں نے عرض کی کہ وہ مجھے اس چیلنج کا جو جواب محترم پرویز صاحب نے دیا ہوگا وہ آپ نہ بتائیں بلکہ میں ابھی بتائے دیتا ہوں کہ وہ اسے سُن کر ضرور مسکرا کر چلے گئے ہوں گے۔اُنہوں نے مجھ سے وضاحت چاہی کہ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ بھاگ گئے تھے۔مَیں نے جواب دیا کہ وہ ہمیشہ قرآن سے ہدایات لیتے تھے اور اسی لئے اُس محفل سے کنارہ کشی کر لی جہاں غیر منطقی لغو معیار کی بات ہو رہی ہو۔

پھر میں نے اُن کے سامنے محترم پرویز صاحب کی مرتب کی ہوئی لغات القرآن کی کاپی رکھ دی کہ اس میں کسی ٹائپ کی غلطی کو صرفِ نظر کرتے ہوئے کسی قسم کی مستند سند کا حوالہ کے بغیر اور یا پھر اُس میں سند سے مختلف مواد ہونے پر اُن کی طرف سے تحریف کرنے کی غلطی کی نشاندہی کر دیں۔اگر اِس کا تسلی بخش جواب نہ دستیاب کیا جا سکے تو میں اُن کی عربی زبان میں

مہارت نہ ہونے کا سوچ سکتا ہوں۔

اپنے اِن معصوم اور مہربان پروفیسر صاحب کا نام تو میں اب اِس عُمر میں بھول گیا ہوں، لیکن اتنا یاد ہے کہ اُن کا اور اُن کے دونوں بھائیوں اور والد کا نام میاں سے شروع ہوتا تھا اور آخر میں صدیقی کی چھوٹی "ی" پر ختم ہوتا تھا۔ وہ سبھی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور تعلیمی درسگاہوں میں ممتاز مقام کے حامل تھے، لیکن مجھے اُن کی طرف سے تحریف کی نشاندہی موصول ہونے کا بیس سال سے ابھی تک انتظار ہے۔

محترم، آپ محترم پرویز صاحب کی سوچ پر تنقید ان اصولوں کی خلاف ورزی کی نشاندہی کی بِنا پر کر سکتے ہیں، اگر آپ ان کے اصولوں سے مُتفق ہیں جیسا کہ آپ نے لکھا ہے۔ ویسے ہی عمومی قسم کے تصورات کو ہر ایک پر ٹھونسا جانا علمی روش نہیں بلکہ میرٹ پر لاگو کی جاتی ہے۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ حق نا قابلِ تقسیم وحدت ہوتا ہے اور اگر اُس میں باطل کا شائبہ بھی شامل ہو جائے تو وہ سب کا سب باطل کہلائے گا۔ لہٰذا قرآن میں پورے کا پورا داخل ہوا جاتا ہے اور مصلحت Compromise کی گنجائش نہیں رکھی جاتی۔ Either you are with me or against me یہی ہماری مملکتِ پاکستان کا مومن اور کافر میں تقسیم ہونے کا دوقومی نظریہ ہے۔

ایک تائیدی بیان ایک بلوچ سینئر بیوروکریٹ کے قلم سے نکلا ہے اور ظاہر ہے کہ بلوچ اپنا ایک مخصوص لہجہ رکھتا ہے۔ اب ناراضی پر مبنی مزید وضاحتیں ہمارے اس بلوچی دوست سے مانگی جا رہی ہیں۔ بعض اوقات کُچھ احباب فیس بُک پر آ کر جان بوجھ کر غیر منطقی بحث میں اُلجھانے اور اُس پر بیجا اصرار کر کے تنگ کرنے کا ایجنڈا لے کر آپ سے فضول باتوں پر بحث شروع کر دیتے ہیں اور شریفانہ انداز سے اُسے ختم ہونے نہیں دیتے۔ ایسے میں ہمارے یہ بلوچ دوست رحمت کا فرشتہ بن کر مدد کو آتے ہوئے اپنے تحکمانہ لہجے سے ان کو کھری کھری سُنا کر بھگا دیتے ہیں۔

مجھے ایک صاحب کی طرف سے شکایت موصول ہوئی کہ:

اعتراض:۔ کچھ نقل کرنے کے بعد پرویز صاحب کا نام دینا چاہیے تھا، کسی کی تحریر کو اپنے نام سے منسوب کرنا ادبی سرقہ ہے۔

جواب: شروع ہی میں واضح کر دیا گیا ہے کہ یہ سلسلہ علامہ پرویز کے دروس سے انتخاب کیا گیا ہے۔ انتخاب کیا ہوا مواد میری ذُمہ داری ہے اور میں اس کے لئے جوابدہ بھی ہوں۔ لہٰذا اس پر اعتراض کا جواب دینا اور مزید وضاحت کرنے کا فریضہ نبھا رہا ہوں۔ اس میں ادارہ کی رضامندی بھی ہے اور میں اُس کے نمائندے کا فریضہ بھی ادا کر رہا ہوں۔ سر اگر تسلی نہ ہوئی ہو تو آپ مزید ہدایات سے نوازیں تا کہ سرقہ کی سزا کے طور پر ہاتھ کٹوانے سے بچ سکوں اور قرآن کے ابلاغ کا سلسلہ بھی جاری رہ سکے۔

شکریہ

The Human Self and Allah

Episode No. 12

By G. A. Parwez
(Translated by: Dr. Ejaz Rasool)

And:

...they guard him by command (Amr) of Allah...(13:11)

They descend by His *Amr*:

We descend not but by command (Amr) of your Sustainer...(19:64)

And they are the custodians and messengers of Allah's *Wahi*:

He does send down His angels (forces) with inspiration of His command (Amr)...(16:2)

4.10 *Wahi* is also Allah's *Amr*

Wahi which is sent is also through Allah's *Amr*:

...By His command (Amr) does he send Wahi to any of His servants...(40:15)

Regarding the Book of Moses, it is stated:

You (O Rasul) were not on the Western side when We sent Amr to Moses...(28:44)

Here *Amr* means the *Wahi* of Allah. In another verse it is stated:

And We granted them clear signs in Amr...(45:17)

And We provided clear signs to Bani Israel of *Amr*. Here,the purpose of *Amr* is also Allah's *Wahi* or Sharia commands for Moses. In the next verse it is stated:

Then We put you on the path of Sharia: so follow you that and follow not the desires of those who know not. (45:18)

4.11 *Amr* Meaning Deen

In these verses, by *Amr* is meant Deen, and Deen and *Wahi* are one and the same thing. This is why the Quran and its commandments are also called the *Amr* of Allah in another verse. In Surah *At-Talaq* in relation to commands regarding woman, it is stated:

That is the command (Amr) of Allah, which He has sent down to you…(65:5)

In other words, those laws which are given through *Wahi* so that human society can be shaped according to them.

4.12 Allah's *Amr* and *Laila-tul-Qadr*

Differentiation in affairs took place that night in which the revelation of the Quran commenced (difference between *Haqq* and *Batil*):

In that (night) is made distinct every affair of wisdom. By command, from Our presence…(44:4-5)

That very night which is called *Laila-tul-Qadr:*

Therein come down Malaika and Ar-Ruh by the law of their Rabb, carrying every Amr. (97:4)

4.13 *Ar-Ruh* is Allah's *Amr*

And *Ar-Ruh* is also Allah's *Amr*:

(O Rasul!) They question you regarding Ar-Ruh. Say: 'Ar-Ruh (comes) by command of my Sustainer: of knowledge (of Allah's affairs) it is only a little that is communicated to you. (O men!) (17:85)

Here, by *Ar-Ruh* is meant the *Wahi* of Allah. Further details of this will be

available in the book *Iblees O Adam*.

4.14 *Amr* Meaning Command

In some places *Amr* has also been used to mean command e.g. the *Anbiya* used to provide guidance according to Allah's *Amr* (command of Allah):

> We made them leaders, guiding (men) by Our command (Amr)...(21:73)

In another verse the word *Izn* is used for this. It is statedabout Rasul-ullah:

And as one who invites to Allah by His Izn and as a Lamp spreading Light. (33:46)

The Imams of Bani Israel also used to provide guidance according to Allah's *Amr*:

> And We appointed, from among them, leaders, giving guidance under Our command (Amr)...(32:24)

Here,*Amr* can mean the Divine laws and also the Deen of Moses because as we have seen above the meaning of *Amr*is Deen and also the Divine laws. In these verses too, the meaning of *Amr* will be the Divine laws. The reality is that as far as the outer world or human society is concerned, by command or *Izn* or *Amr*is meant the Divine laws, according to which all these affairs are conducted.

4.15 *Izn* and *Amr*

In Surah *Al-Saba*there is mention of those 'Jinns' who used to serve Solomon. While mentioning them,the synonymous words *Izn* and *Amr*are quotedin one verse:

> ...And there were Jinns who worked in front of him, by the Izn of His Sustainer, and if any of them turned aside from Our Amr...(34:12)

By 'Jinns' is meant those uncivilised tribes who used to carry out various tasks in the kingdom of Solomon. (Details will be available in my book *Iblees 0 Adam*).

5 *Khalqiyat* (Creation)

It has been noted under the previous topic that according to the programme of Allahthere are two phases of creation. The first phase is of the domain of *Amr*in which the thing to be created is in its non-visible and non-perceptible form. The second phase is of creation in which that thing comes before us in a visible form. This is an arbitrarydivision as the term *Khalq* can otherwise be used at every stage.

5.1 Linguistic Meaning

The linguistic meaning of *Khalq*is to measure something, to estimate it, to make something according to some other thing, to set aright the proportion and balance of something. From these meanings the essence of *Khalq* will be to make something according to a specific standard and estimate by creating proportion and balance between various elements. Seen from this aspect *Takhleeq* will also have two steps. One is to bring different elements into existence from nothing, for which the Quran has used the words *Badee* and *Fatir* (their explanation will come later),and the second step is to keep producing ever new things from these created elements by employing different formulations. In this it could also be that when a thing (according to a specific order and scale) has been created once, it can berepeated in the same way i.e. it continues to be made over and over according to the same pattern, and it can also be thatnew additions keep taking place in the created things. The Quran has mentioned both these aspects.

5.2 Beginning and Repeating

A question is posed about the first phase:

> …Who originates creation, then repeats (Yu-eedu-hu) it…(27:64)

And a response is given:

> It is Allah Who begins creation; then repeats (Yu-eedu-hu) it; and your every step moves towards His defined stages. (30:11)

Afew verses later, the Quran states:

> It is He Who begins creation; then repeats (Yu-eedu-hu) it; and for Him it is most

easy…(30:27) See also (29:19, 10:34)

The meaning of *Yu-eedu-hu*is not merely 'repeating', it also means to give rotation. This means that following the commencement of its creation, by giving it rotation and passing it through different revolutionary stages in this way He (Allah) takes it to its point of completion. This process of the passing of things of the universe through various stages and phases totheir point of completion can be comprehended by man, and now it has also become apparent as a scientific fact (according to the modern theory of evolution),but the start of the creation i.e. the process of its coming into existence from nothing cannot come within the grasp of the human intellect. This is why the Quran has not gone into the details of this. By saying only this much it has moved forward, that Allah:

To Him is due the primal origin of the heavens and the earth…(2:117)

Say: 'Shall I take for my protector any other than Allah, the Creator of the heavens and the earth (from nothing)? (6:14)

Being *Badee* or *Fatir*in this way is the same as that which is expressed through the words 'Be! and it is'.The meaning of 'Be! and it is' has been explained in Chapter 4. At that point this was made clear that from this it is not meant that everything sprouts outfrom somewhere just like that. In the system of the universe the creation of everything comes into being according to a specific Divine law. For the seed to becomea tree, andfor the drop of water to become a pearl, many stages have to be traversed.Regarding all these mattersit is noted in the Quran that by passing through different stages, different phases and different levels,these acquire their final and complete form. This is why from 'Be! and it is' is meant that for the commencement of something Allah does not require any materials and causes, their beginning is according to His command and intention, and then according to His Own determined laws those things adopt their final formby passing through various stages.

5.3 Heavens and Earth

This is a fact that Allah Alone has created the entire system of the universe, but the Quranic technique is thatit explains in numerous ways thatreality which it wishes to engrave more profoundly on the heart. For example,it is stated as a question:

Or, who has created the heavens and the earth…(27:60)

Who is it that has created the heavens and the earth? And another time this fact is brought forwardby this method, declaring that even if these people who oppose the Quran in this wayare asked,who is the creator of the heavens and the earth, they too will acknowledge this fact that the creator of the system of the universe and the earth is indeed Allah. For example:

If you were to question them, 'Who created the heavens and the earth?' They would be sure to reply, 'These were created by Him, the exalted in Power, full of Knowledge'. (43:9) See also (29:61, 31:25, 39:38)

At some places this same truth is explained inthis way that whatever is in the physical world, its Creator is that same true Allah, however, if you accept a god other than Him, then specify what did this god create? After mentioning the creations of the heavens and the earthin Surah *Luqman*, the Quran states:

Such is the creation of Allah: now show Me what is there that others besides Him have created; nay, but the transgressors are in manifest error. (31:11)

Then He gives answers to these questions Himself, that this is their omission that they are making gods of others. All this is created by Him and He is the Creator of all:

All Hamd is for Allah Who created the heavens and the earth and Who made the darkness and the light…(6:1)

Along with this the Quran also made this reality clear that Allah did not create this system of the universe futilely and pointlessly, without purpose and meaning, without aim and need, but created it with infinite wisdom. There is a specific purpose for its creation. Since materialistsare not convinced of the existence of a metaphysical force behind this system, their belief is that all things of creation have come into existence via blindnature, just like that without any purpose, need, aim andreason, and will end in the same way. Repudiation of this beliefis done in the Quranusing different means and techniques. It states:

Not without purpose did We create heaven and earth and all between! That were the thought of Kafirs! But woe to Kafirs because of the fire (consequences of denial)!

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی قرآن کریم کے احکام وقوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر امت کے مشورہ سے متعلقہ امور کے فیصلے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاج رسالت کہا جاتا ہے۔

8- بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے امت میں انتشار پیدا ہو گیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امورِ دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔ لیکن بعد میں مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہو گئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

9- ہمارے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو امت کو احکام وقوانین خداوندی کے مطابق چلائے۔ اس نظام کی بلندترین اتھارٹی کو مرکز ملت کہا جائے گا اور اس کی طرف سے جاری شدہ احکام کی اطاعت خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت کے قائم مقام قرار پائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانین خداوندی کے تابع ہوگی۔

10- چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہوگا' اس لئے اس میں موجودہ ثنویت ختم ہو جائے گی۔ یعنی اس میں یہ نہیں ہوگا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کے لئے مذہبی پیشوائیت کی طرف۔ اس میں یہ دونوں شعبے باہم گر مدغم ہو جائیں گے۔

11- جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہو جاتا' امت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر نماز' روزہ وغیرہ اسلامی احکام پر عمل کر رہے ہیں' کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی ردو بدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کر کے اسے ''خدا اور رسول ﷺ '' کا طریقہ قرار دے۔ یہ حق قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کو پہنچتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ امت کے اختلافات کو مٹا کر اس میں وحدت پیدا کرے۔

12- قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ نظام تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی' روٹی' کپڑا' مکان' علاج' تعلیم وغیرہ بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

13- قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہو سکتا ہے نہ ان سے مفاہمت کر سکتا ہے۔ خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو' یا سوشلزم کا آمرانہ اشتراکی نظام۔ اس کے نزدیک یہ سب نظام ہائے زندگی غیر خداوندی ہیں لہٰذا باطل۔

14- جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو' یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

15- ہم' رسول اللہ ﷺ کے بعد' ہر قسم کے مدعی وحی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

16- طلوع اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے (اسے فرقہ اہل قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں)' نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک دین میں فرقہ سازی شرک ہے۔ امت کے مختلف فرقے جس طریق سے نماز' روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے ہیں' ہم ان میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں کرتے۔ ہم صرف قرآن کریم کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تاکہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کا قیام عمل میں آ سکے۔ یہ ہے ہمارا مقصد' جسے ہم برسوں سے دہراتے چلے آ رہے ہیں۔

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.75
ISSUE
11

Monthly **TOLU-E-ISLAM**

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org
www.facebook.com/talueislam/ www.youtube.com/idaratolueislam

ہند میں حکمتِ دیں کوئی کہاں سے سیکھے
نہ کہیں لذتِ کردار، نہ افکارِ عمیق
حلقۂ شوق میں وہ جرأتِ اندیشہ کہاں
آہ محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق!
خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق!

(ضربِ کلیم، اقبالؒ)